پطرس

ایک مطالعہ

کرنل غلام سرور

مطبوعات حرمت
بینک روڈ، راولپنڈی

رائٹرز گلڈز پاکستان سے انعام یافتہ

پطرس
ایک مطالعہ

بمعہ انتخاب تخلیقاتِ پطرس

کرنل غلام سرور
ستارۂ امتیاز (ملٹری)

مطبوعاتِ حرمت
جینک روڈ ۰ راولپنڈی فون : ۶۲۰۰۷

جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ

نام کتاب ——— پطرس — ایک مطالعہ

مصنّف ——— کرنل غلام سرور

طبع دوم ——— ستمبر ۱۹۸۵ء

تعداد ——— ایک ہزار

مطبع ——— ایس ٹی پرنٹرز گوالمنڈی راولپنڈی

ناشر ——— زاہد ملک

قیمت ——— ۴۰/۰ روپے

مطبوعاتِ حُرمت

انتساب

مرحوم ابّا جی کے نام جنہوں نے مجھے
قلم پکڑنا سکھایا۔

فہرستِ مضامین

حصّہ اوّل

پطرس ایک جائزہ

۱	پطرس۔ شخصیت	۱۷
۲	پطرس۔ فکر و فن	۳۴
۳	پطرس۔ بحیثیت مترجم	۴۵
۴	پطرس کے تعلیمی نظریات	۵۱
۵	پطرس اور قدیم یونانی حکما	۵۳
۶	پطرس تنقیدی مضامین کے تناظر میں	۵۶
۷	پطرس بحیثیت انشاپرداز	۶۰
۸	پطرس اور فن دیباچہ نویسی	۶۸
۹	پطرس خطوط کے آئینے میں	۷۰
۱۰	پطرس بحیثیت شاعر	۸۱
۱۱	پطرس نشریات کے میدان میں	۸۸
۱۲	پطرس اقوام متحدہ میں	۹۰
۱۳	حرفِ آخر	۱۰۵

حصّہ دوم

اِنتخاب تخلیقاتِ پطرس

ادب لطیف :

۱۴	تنزل	۱۰۹

۱۵ وارفتگیٔ جذبات ۱۱۱
۱۶ **مزاحیہ مضامین** ۱۱۵
۱۷ **پطرس کے مضامین** ۱۲۷

منظومات :

۱۸ دلّی کی سیر
۱۹ میکدے میں

سفرنامے :

۲۰ سفر انگلستان ۱۴۹
۲۲ میکسیکو کے کوچہ و بازار ۱۷۵

دیباچے :

۲۱ چمپا اور دوسرے افسانے ۱۸۳
۲۳ ایک غیر مطبوعہ کتاب کا دیباچہ ۱۸۶

افسانے :

۲۴ عشق کی خودکشی ۱۹۰
۲۵ صید و صیاد ۱۹۸

تنقیدی مضامین :

۲۶ ہمارے زمانے کا اردو ادیب ۲۲۱

نیازمندانِ لاہور کا سلسلہ :

۲۷ یوپی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں ۲۳۱

خطوط :

۲۸ بنام عبدالمجید سالک ۲۴۲
۲۹ بنام عبدالرحمٰن چغتائی ۲۴۴
۳۰ بنام سید امتیاز علی تاج ۲۴۵

تعارف

پطرس چمنستان ادب کا وہ پھول تھے جو بن کھلے مرجھا گیا۔ میں پطرس کے فنی کمالات کی عظمت کا شناخواں بھی ہوں اور پطرس کی ناکردہ کاریوں پر سوگوار بھی! ان کے مزاحیہ مضامین کا مختصر مگر سدا بہار مجموعہ دنیائے ادب میں ان کی حیاتِ دوام کا ضامن ہے مگر مزاح نگاری پطرس کی تخلیقی شخصیت کا صرف ایک رخ ہے۔ جو لوگ ان کی غیر معمولی ذہانت اور بے مثال طباعی سے آشنا ہیں انہیں احساس ہے کہ پطرس اپنی شخصیت کے تمام تر تخلیقی امکانات کو بروئے کار لائے بغیر ہی ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ بقول فیض احمد فیض

"ان کی زندگی کے بیشتر لمحات موجودات کے ہر مظہر سے خوبی اور حسن اور انبساط کے اخذ و استفادہ میں گزرے اور وہ قلب و نظر کی اس دولت کو عمر بھر محفلوں، دانش کدوں، ایوانوں اور گزرگاہوں میں یوں بکھیرتے رہے کہ اپنے نام کی یادگار کے لئے اس کا عشر عشیر بھی نہ بچا۔ مجھے اس دور کی کوئی ایسی شخصیت معلوم نہیں جس نے اتنے بہت سے لوگوں کے لئے لطف و مسرت دریافت اور تخلیق کی ہو۔"

بلاشبہ یہ بہت بڑی نیکی ہے مگر اس نیکی سے تو فقط حلقۂ یاراں اور بزم نیازمنداں کے خوش نصیب ہی شادکام ہوئے اور یوں پطرس کا فیضان ایک مختصر دائرے میں محدود ہو کر رہ گیا جبکہ پورے پاکستان کی تہذیبی زندگی پطرس کے فکر و نظر کو ترس رہی تھی۔ پطرس کی ذات جن تضادات میں اسیر تھی ان کا ذکر کرتے ہوئے پطرس نے لکھا تھا کہ وہ "عالم اسلامی کے اتحاد کے خواب دیکھنے کے ساتھ ساتھ مغلیہ عیش و عشرت کے خواہشمند تھے۔" مغلیہ عیش و عشرت

کے خوابوں نے پطرس کو مسند عالم سے اٹھا کر کرسیٔ دربار پر جا بٹھایا ۔ بعد کرسیاں بدلنے لگیں مگر خدا لگتی بات یہ ہے کہ پطرس جس کرسی پر بھی بیٹھے کرسی کا قد پطرس سے چھوٹا ہی نظر آیا پطرس اپنی متاعِ دانش ان چھوٹے موٹے کاموں میں لٹاتے رہے جنہیں کوئی بھی ناکام وکیل سرانجام دے سکتا تھا اور پطرس کے علمی منصوبے اور تخلیقی خواب پطرس کی راہ دیکھتے رہے ۔

پطرس کے علمی منصوبوں اور تخلیقی خوابوں کا حال ان خطوط سے کھلتا ہے جو انکی وفات کے بعد پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے تھے ۔ یہ خطوط ہماری تہذیبی زندگی کی اہم دستاویز ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اپنی تہذیب کے تحفظ اور احیاء کی خاطر پاکستان قائم کرنے کے فوراً بعد ہم آزادی کی برکتوں کو فقط مادی نعمتوں تک محدود جاننے لگے ۔ اور دائمی حقیقتوں کو فراموش کر کے عارضی پرچھائیوں کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے ۔ انہی پرچھائیوں کے تعاقب میں پطرس وطن سے دور نکل گئے مگر وطن سے جتنے دور ہوتے گئے اہل وطن کو اسی شدت سے یاد کرنے لگے ۔ اب پطرس کے شب و روز اہل وطن کے لئے پیچ و تاب میں گذرنے لگے جس طرح لاہور کے کسی گوشے میں کوئی بصورت سائن بورڈ لٹکا دیکھ کر وہ ہمہ تن سوز بن جایا کرتے تھے اور ان اسلاف کی یاد میں کھو جایا کرتے تھے جنہوں نے خطاطی کے فن کو فن بنایا تھا اسی طرح نیویارک کے بک سٹال پر ملک راج آنند کی کتاب "انڈین تھیٹر" میں آغا حشر کے خلاف "جہل و تعصب" کا اظہار دیکھ کر سراپا غیض و غضب بن گئے تھے ۔

اس غیض و غضب کا اظہار پطرس ایک کتاب کی صورت میں کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے انہوں نے سید امتیاز علی تاج اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کو بار بار خط لکھ کر متعلقہ مواد بھجوائیں مگر اس خط و کتابت کا نتیجہ بھی وہی ہوا جو تمام تعلیم کی فرنگی بنیادیں ڈھا دینے کے منصوبوں کا ہوا تھا ۔ پہلی صورت دوسری صورت سے زیادہ المناک ہے

اس لئے کہ جہاں تک نظامِ تعلیم سے متعلق مشوروں کا تعلق ہے وہ مرحوم کا اور حکومت کا معاملہ تھا مگر کتابیں بھجوانے کی فرمائش ان کا اور ان کے دوستوں کا معاملہ تھا اسی پر بس نہیں جب پطرس کو ایک یونیورسٹی میں اردو زبان وادب کی تاریخ اور ارتقا پر لیکچر دینے کی آرزو تھی جب وہ پاکستانیت پر ایک کتاب مرتب کرنا چاہتے تھے۔ بچوں کے لئے درسی کتب میں تصنیف کرنے کے آرزومند ہوئے۔ جدید اردو ادب کا ایک نمائندہ انتخاب انگریزی میں پیش کرنے پر کمربستہ ہوئے۔ تب بھی ان کے دوستوں اور پاکستان کے دانشوروں کا طرزِ عمل اس سے مختلف نہ تھا۔ چنانچہ پطرس کو کہنا پڑا کہ :

"برادرِ عزیز ! قلم میں وہ اثر کہاں سے لاؤں، جو آپ کے دل کو پگھلا دے باوجود عاجزانہ منت سماجت کے، آپ کے خط کے جواب سے محروم ہوں"۔

پطرس اسی محرومی کے عالم میں ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر دوسری دنیا کو سدھار گئے اور ہم کہ جنہیں مغلیہ عیش وعشرت کے خوابوں نے آلیا ہے۔ پطرس کو فقط ایک ایسے مزاح نگار کے طور پہ یاد کرتے چلے آئے ہیں جس نے اردو ادب میں انگریزی مزاح کا رنگ رس پیدا کیا اور جس کی ذات مشرق اور مغرب کا حسین امتزاج تھی۔ بے شک یہ بھی بڑی بات ہے اور اتنی عظمت بھی پطرس کے معاصرین میں سے کتنوں کے حصے میں آئی ہے؟ مگر پطرس، یہی کچھ نہ تھے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ ان کی ہمہ گیر اور ہمہ صفت شخصیت کے چند ایک امکانات بروئے کار آسکے اور جو لاتعداد امکانات حقیقی رہے۔ ہماری تنقید ان کا احاطہ کرنے میں ناکام رہی ہے

نقدِ پطرس کی اس رسائی ونارسائی کے پس منظر میں کرنل غلام سرور کی تصنیف "پطرس - ایک مطالعہ" - ایک قابلِ قدر پیش کش ہے۔ کرنل غلام سرور آج کے معروف ترین نقاد اور مبصر ہیں۔ ان کا قلم انگریزی اور اردو ہر دو زبانوں میں رواں ہے۔ سلامتی طبع اور دقتِ تفکر کے گوہر نایاب ان کے ہاں عام ہیں۔ اپنی تصنیف میں

انہوں نے پطرس کے علمی و فنی کارناموں، پطرس کی شخصیت کے طلسمات اور نقدِ پطرس کا ایک خوبصورت اور سیر حاصل جائزہ پیش کیا ہے۔ ایک معلّم و مدبّر، ایک نقاد و مترجم اور ایک ادیب و فنکار کی حیثیت سے پطرس نے جو گوناگوں کارنامے سرانجام دیئے ہیں کرنل غلام سرور نے ان سب کو اپنی کتاب میں حسن و خوبی کے ساتھ سمیٹ لیا ہے اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ پطرس کے کارناموں پر اتنی مفصّل اور اتنی دلکش کتاب اب تک منظرِ عام پر نہیں آئی۔ اس کتاب میں پطرس کے فکر و فن کا مطالعہ بھرپور، پطرس کی شخصیت کا نقش جاوداں اور اسلوبِ تحریر رواں دواں ہے۔ کرنل غلام سرور اس تصنیف پر ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

مطبوعاتِ حرمت کے جناب زاہد ملک خود ایک منفرد مزاح نگار ہیں۔ شاید اسی لئے انہوں نے مشاہیرِ ادب پر اپنے سلسلۂ کتب کی ابتدا پطرس بخاری سے کی ہے۔

فتح محمد ملک

قائدِ اعظم یونیورسٹی
اسلام آباد

پیش لفظ

مزاح نگاری کی دُنیا بھی کیا دُنیا ہے ؟ آپ جس جُملہ پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں اُس کے تحلیلی مطالعہ سے گریز ہی کریں۔ مبادا سنجیدہ ہو جائیں اور اُس جُملہ سے اور خود اپنے آپ سے شرمندہ ہو جائیں۔ مزاح کے باب میں تحلیل و تجزیہ سمِ قاتل کا حکم رکھتا ہے لیکن بعض مزاح نگاروں کا معاملہ جُدا ہے۔ اُن کی شخصیت اس درجہ پہلو دار ہوتی ہے کہ اُنکی مزاحیہ تحریروں کے امکان بھر تجزیہ کے بعد تحریر کے انار سے ظرافت کی پھُل جھڑیاں چھوٹتی رہتی ہیں۔ پطرس مرحوم کی مزاح نگاری بھی اُسی قبیل کی تھی۔ وہ مزاح پیدا کرنے کی غرض سے نہ لکھتے تھے، ان کی ذہانت دو بدیہی حقیقتوں کا ایک ایسا مرکب احساس تخلیق کرنے پر قادر تھی کہ مزاح شناس قارئین کے ذہن غیر رضاکارانہ طور پر یکایک جاگ اٹھتے تھے اور اُن کی خوابیدہ رگِ ظرافت اپنا کام شروع کر دیتی تھی۔ مسکراہٹ، معنی خیز ہنسی اور پھر زوردار قہقہہ وہ مدارج ہیں جو قارئینِ مزاح کی مرضی پر موقوف نہیں ہیں کہ وہ طے شدہ پروگرام کے تحت مطلوبہ کیفیت کا بٹن دبا دیں اور صحیح کیفیت پیدا ہو جائے۔ اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ مزاح کی بندوق یکایک فائر کرتی ہے۔ اور مُرغِ بسمل تڑپنا شروع کر دیتا ہے۔ اپنے ذہن کی بلوغت اور بین السطور جھانکنے کی صلاحیت کے بقدر۔

"پطرس ایک مطالعہ" کرنل غلام سرور کی ایک ایسی تصنیف ہے جس کے ذریعہ پطرس کا ہمہ جہتی مطالعہ مقصود ہے۔ وہ مختلف الجہات تھے۔ وہ اتنے بہت سے شعبوں میں بیک وقت دسترس رکھتے تھے کہ صرف ایک صفت کا مطالعہ ہی ایک مبسوط کتاب کا طالب ہو سکتا تھا

لیکن کرنل غلام سرور بھی سٹریٹجسٹ (STRATEGIST) ہیں۔ کم سے کم صفحات میں زیادہ سے زیادہ جہتوں کا احاطہ کرنے نکلے ہیں جب مقصد یہ ہو تو پھر مطالعہ اور مشاہدہ کا طیارہ زیادہ بلندی ہی سے تصویر کشی کرتا ہے۔ اور اس طرح بہت سے 'مناظر' کی تفصیلات سے صرفِ نظر کرنا پڑتا ہے۔

پطرس 'مصنف' کے قول کے مطابق اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، وہ ادب اور انشاء طنز و مزاح اور تنقید عالیہ میں دور دور تک اپنا ثانی نہ رکھتے تھے" وہ استاد تھے، منتظم تھے، سفارت کار تھے، دوستوں کے دوست تھے، انشا پرداز تھے، طنز و مزاح کی صف میں سر فہرست، انگریزی ادبیات کی تدریس کے ساتھ ساتھ انہیں مزاح کے اجزائے ترکیبی اور اس کے موسمی تغیرات کے بارے میں تحلیلی طرز کا مطالعہ کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ انگریز قوم کی حسِ مزاح بلغمی مزاج کے لوگوں سے مختص تھی تو اپنے منطقہ کی حسِ مزاح کیا ہو سکتی تھی (جہاں زندگی سے موت تک کا سفر جلد اور بہت جلد طے ہوتا ہے اور سیدھی سادھی زندگی بھی "میلو ڈرامہ" نظر آتی ہے، پطرس انگریزی اور یورپی مزاح کے بارے میں خاصے شعوری تھے لیکن جب گیند اپنی کورٹ میں آئی تو وہ اس سے قدرتی طور سے کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔

تربیت یافتہ نگاہ و ذہن نے زاویۂ نگاہ پر بھی خاصہ گہرا اثر مرتب کیا۔ اُن کی خوبی یہ تھی کہ وہ صرف انگریزی زبان و ادب ہی کے پارکھ نہ تھے۔ وہ اُردو ادب اور کلاسیکی ادب کے بھی اس درجہ رسیا تھے کہ اُن کی ذات مشرق و مغرب کے نمائندہ ترین اجزاء کا سنگم بن چکی تھی۔ وہ ان مغرب زدوں میں سے نہ تھے جن کے لئے مشرق ایک ٹھٹھول ہے اور نہ اُن مشرق پرستوں میں سے تھے جن کے لیے مغرب فسق و فجور سے عبارت ہے اور شیطان سے سائنس و ٹیکنالوجی کے عوض اپنی 'روح' کا سودا کر چکا ہے۔ یہ دونوں رویئے ہموار تہذیبی شخصیت کے رویئے نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا پطرس اس قسم کی تن آسانی پر ایک گہرا طنز تھے۔ اپنی ذات ہی میں مشرق و مغرب کی دوئی کے بارے میں لغو سوال کا مُسکت جواب تھے۔

کرنل غلام سرور نے اپنی تازہ ترین تصنیف میں پطرس بخاری کی زندگی کے ہمہ جہتی پہلوؤں پر بڑے پیار اور احترام کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اس تصنیف میں معروض کی تفہیم کی راہ میں 'موضوع' قربان کرنے کی روش کا مظاہرہ نہیں اس لئے مزاح و طنز سے عبارت شخصیت کے بارے میں واقعیت پسندانہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ کرنل غلام سرور نے اپنی تحریر پر حاشیہ آرائی کی بیل چڑھانے سے پرہیز کیا ہے لیکن یہ سارا کام کسی ایسے ثقہ پن سے بھی سرانجام نہیں دیا گیا ہے کہ پطرس کی تفہیم میں رکاوٹ پیدا ہو۔ کرنل غلام سرور کے اسلوب نے اس حقیقت کا واضح ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ جب اعلیٰ مزاح نگار پر قلم اٹھتا ہے تو ظرافت خود بخود دُور ہوتی چلی جاتی ہے اور علم ریاضی کا ڈسپلن اہم ہو جاتا ہے۔

کرنل غلام سرور، پطرس بخاری کی ہمہ جہت شخصیت سے پوری طرح متاثر ہیں۔ وہ اقوام متحدہ میں نو آبادیاتی نظام کے خلاف سرگرم جدوجہد کرنے والے بخاری کی شخصیت کے اس رُخ سے واقف ہیں جس کے تجزیات بسا اوقات گریہ ناک ہوا کرتے تھے اور عالمی ادارے کے سٹیج پر ظالم اقوام کے خلاف غم و غصہ کی لہریں پیدا ہو جایا کرتی تھیں۔ طنز و مزاح اور موثر سنجیدہ استدلال بیشتر اوقات عمل جراحی جیسے نتائج حاصل کرتے ہیں۔ طریقے الگ الگ ہوتے ہیں۔ پطرس ہر رنگ میں ایک ہی شخصیت تھے۔ انہوں نے ظلم و استبداد کی خو کے خلاف بھی اسطرح لکھا جس طرح وہ جھوٹ اور مکر کے خلاف لکھتے تھے۔ ظلم و استبداد کے خلاف تحریریں ظالموں کے چہروں پر شکنیں ڈال دیتی ہیں۔ جھوٹ اور مکر کے خلاف تحریریں ان ہزیمت یافتوں کی شکار انسانیت کو زعفران زار کر دیتی ہیں کہ شاید اعصابی صحت کی استواری کے لئے ضروری ہے — ایک نوع کے قانون ازالہ کے مترادف ہے۔

بظاہر یہ کتاب پطرس بخاری کے مختلف النوع پہلوؤں پر طائرانہ مطالعوں کا مجموعہ ہے لیکن قارئین اس کتاب کی مدد سے ایک ایسے پطرس بخاری سے زیادہ بہتر طور پر واقف ہو سکیں گے جو لائق توجہ ہے۔

کرنل غلام سرور قابلِ مبارک باد ہیں کہ ان کی کتاب ہر لحاظ سے ایک کامیاب اور ہمہ جہت تہذیبی شخصیت کے بارے میں انتہائی ہمدردانہ اور نیازمندانہ تصنیف ہے۔

محمد علی صدیقی
۲۵ جون ۱۹۸۱ء

پطرس ایک جائزہ

پطرس شخصیت

احمد شاہ بخاری اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ ادب و انشا، طنز و مزاح اور تنقیدِ عالیہ میں دَور دَور تک اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ وہ بیک وقت ایک بلند پایہ عالم، ایک صاحبِ طرز ادیب، ایک عہد ساز استاد اور ایک سخت گیر منتظم تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہم جلیس، بذلہ سنج اور بے فکر بانکے بھی تھے۔ سیاست کے میدان میں بھی ان کا بڑا بلند مقام تھا۔ بخاری گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر کی حیثیت سے، آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے، پھر اپنے کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے، اس کے بعد اقوام متحدہ میں پاکستانی نمائندے کی حیثیت سے، جہاں کہیں بھی رہے، سربلند، ممتاز اور نمایاں رہے۔ انگریزی میں کمال پیدا کرنے کے باوجود وہ انگریزی زدہ نہ تھے۔ ادبیات کے علاوہ دیگر تمام فنونِ لطیفہ سے بھی ان کو گہری دلچسپی تھی۔ ان کے منہ سے جو بات نکلتی تھی وہ ظرافت کی چاشنی کے بغیر نہ ہوتی تھی۔ اسی خصوصیت نے ان کو بزم آرا بنا دیا تھا۔ جب وہ کسی محفل میں شریک ہوتے تو وہاں ظرافت کا دربار لگ جاتا۔ احمد شاہ بخاری زندہ دل بھی تھے، اور روشن دماغ بھی۔ وہ مشرق و مغرب کے حیات پرور ادب کے نشوں سے سرشار تھے۔ وہ بڑے تیز فہم اور حاضر جواب

تھے۔ ان کی حاضر جوابی، مکالمے اور مباحثے کے دوران پھلجھڑیاں بن کر اپنے اظہار کی راہیں تلاش کرلیتی تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر ہمیشہ محفل کی توجہ کا مرکز خود ہی رہنا چاہتے تھے۔ لفظوں کے الٹ پھیر سے، وہ ہر بات اور ہر حرکت میں ایسی لذّت بھر دیتے تھے کہ محفل کی نگاہیں اور کان ان کے لئے وقف ہو جاتے تھے۔

سیّد احمد شاہ بخاری یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ کشمیر سے ہجرت کرکے آئے تھے۔ انکے والد کا نام سید اللہ شاہ تھا وہ پشاور میں خواجہ کمال الدّین وکیل کے منشی تھے۔ سید محمد شاہ رفعت ان کے بڑے بھائی تھے اور سید ذوالفقار شاہ بخاری چھوٹے بھائی (۱)

پطرس ابھی آٹھ برس ہی کے تھے کہ ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ان کے والد سید اللہ شاہ نے دوسری شادی کرلی تاکہ بچوں کی تربیّت اچھی طرح سے ہوسکے۔ حسنِ اتفاق سے سوتیلی ماں نے بچوں پر اپنا بھرپور پیار نچھاور کیا اور انہیں سوتیلے پن کا کبھی احساس نہیں ہونے دیا۔ گھر پر انہیں قرآن شریف پڑھایا اور ابتدائی دینی مسائل سے بھی روشناس کیا۔ بخاری نے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ فارسی قواعد اور ادب کی بنیادی کتابوں کا مطالعہ گھر پر ہی کیا۔ اور گلستان اور بوستان بھی یہیں پڑھیں (۲)

بخاری نے نو برس کی عمر میں مشن اسکول پشاور میں داخلہ لیا۔ ذہن رسا تھا۔ ابتدا ہی سے پڑھنے لکھنے کا انہیں زبردست شوق تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تعلیم کے ابتدائی مراحل میں غیر معمولی قابلیت اور ذہانت کا ثبوت دیا۔ انہیں شاعری سے بھی غیر معمولی لگاؤ تھا۔ وہ بڑے شوق سے نظمیں حفظ کیا کرتے تھے خصوصاً انگریزی نظمیں۔ ان کا انگریزی تلفظ بڑا صحیح تھا۔ ذوالفقار بخاری لکھتے ہیں کہ اسکول میں ایک بار سالانہ جلسہ ہوا۔ اس وقت صوبے کے چیف کمشنر سر جارج روس کیپل تھے اسکول کے کئی لڑکوں نے نظمیں پڑھیں۔ بخاری نے بھی انگریزی میں ایک نظم پڑھی جس پر انہیں بڑی داد ملی۔ کمشنر نے خوش ہوکر انعام کی کتاب کے اندر یہ تاثرات رقم کئے۔

---

(۱) "ہر نفوذ جس کا حسنِ تمنائے گوش تھا"...... محمد عبداللہ قریشی "نقوش" پطرس نمبر صفحہ (۲۹-۳۳)

(۲) پطرس بخاری مقالہ برائے ایم اے پنجاب یونیورسٹی از ریحانہ یعقوب صفحہ ۱

"اے کاش ! میں پشتو اتنی اچھی طرح بولنے لگوں، جتنی اچھی طرح چھوٹا پیر
پیر احمد شاہ انگریزی بولتا ہے" ①

بخاری اسی طرح ہر سال اسکول میں انعام پاتے رہے اور اپنی ذہانت کا لوہا منواتے رہے۔ ۱۹۱۳ء میں میٹرک کا امتحان اعزازی شان سے پاس کرنے کے بعد اسلامیہ کالج پشاور میں داخلہ لیا۔ اور وہیں سے ۱۹۱۵ء میں ایف۔ اے کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا ②

بخاری کے والد شاعر تھے۔ اور بڑے بھائی بھی شعر کہتے تھے۔ اس طرح ادبی ماحول میں پرورش پانے کی بنا پر احمد شاہ بخاری کو بھی شعر و ادب سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اور انہوں نے اور انکے چھوٹے بھائی ذوالفقار بخاری نے شعر کہنے شروع کر دیئے۔ لیکن جب ان کے والد کو خبر ہوئی تو وہ بڑے ناراض ہوئے۔ بخاری شعر کہتے مگر انہیں فضول سمجھ کر پھاڑ دیتے وقت یونہی گزرتا رہا۔ اور انہوں نے ایف اے پاس کر لیا۔

اسلامیہ کالج کی فضا ان کے والد کو پسند نہ تھی بیٹے کی صلاحیتیں پوری طرح نکھر کر سامنے نہ آسکتی تھیں۔ اس لئے ایف۔ اے کے بعد ۱۹۱۵ء میں انہیں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ دلوا دیا۔ اس عظیم تعلیمی درسگاہ کی فضا انہیں خوب راس آئی اور ان کی تمام صلاحیتیں نکھر کر سامنے آگئیں۔

۱۹۱۷ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ان کے رشتے کی بات چلی۔ ان کے رشتہ دار خان بہادر عبداللہ سپرنٹنڈنٹ پولیس چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی کی شادی بخاری سے ہو جائے خان بہادر صاحب کی یہ بھی خواہش تھی کہ ان کے ہونے والے داماد سائنس کے میدان میں نام پیدا کریں۔ ان کی اس خواہش کے احترام میں بخاری نے ایم ایس سی فزکس میں داخلہ لیا مگر باوجود کوشش کے انہیں سائنس کے ساتھ کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو سکی۔ بخاری کی اصل دلچسپی انگریزی

① "بھائی بھائی" از ذوالفقار بخاری نقوش پطرس نمبر صفحہ ۳۴

② پطرس بخاری از ریحانہ یعقوب صفحہ ۲

ادبیات سے تھی اور اسی بنا پر انہیں ۱۹۱۹ء میں "راوی" کا ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا۔ انہوں نے اپنے مخصوص مزاج کے پیش نظر فزکس کی بجائے انگریزی ادبیات میں ایم اے کرنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ فیصلہ انہوں نے بڑے تامل کے بعد کیا۔ اس کے بغیر غالباً ان کے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا۔ انہوں نے ایم اے انگریزی کا امتحان اعزازی شان سے پاس کر لیا وہ یونیورسٹی بھر میں اوّل قرار دیئے گئے۔ (۱)

پطرس کا پورا نام پیر احمد شاہ بخاری تھا۔ بیعت کی صلاحیت سے عاری ہونے کی بنا پر انہوں نے "پیر" کے لفظ کو اپنے نام کا جزو رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ وہ پیر احمد شاہ سے صرف "احمد شاہ" رہ گئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول پشاور کے ہیڈ ماسٹر واٹکنز، پطرس کو "پیر" کے نام سے پکارا کرتے تھے اور پیر کا تلفظ کچھ اس انداز سے کرتے تھے، جیسے یہ لفظ فرانسیسی ہو۔ فرانسیسی لفظ "پیر" کا انگریزی ترجمہ "پیٹر" ہے اور انگریزی لفظ "پیٹر" کا یونانی ترجمہ "پطرس" ہے۔ اس طرح بخاری نے پطرس بطور تخلص اختیار کر لیا۔

بخاری شروع شروع میں انگریزی مضامین "پیٹر" کے نام سے لکھا کرتے تھے پطرس کا قلمی نام سب سے پہلے انہوں نے کہکشاں کے ایک سلسلۂ مضمون کے لئے اختیار کیا۔ مضامین کے اس سلسلے کا نام تھا "یونانی حکما اور ان کے خیالات"۔ مضمون کی رعایت سے "پطرس" اچھا نام تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس سلسلۂ مضمون کے مصنّف کا اصل نام کسی کو معلوم ہو۔ لیکن کہکشاں کے عملے کی بے احتیاطی کی بدولت کسی کاتب نے مضامین کی ایک قسط میں پطرس کے ساتھ ان کا پورا نام بھی لکھ دیا۔ پس اس دن سے انہوں نے اردو تصنیفات کے لئے اپنا قلمی نام پطرس اختیار کر لیا۔ (۲)

لاہور میں تکمیلِ تعلیم کے بعد انہوں نے انگلستان کا رخ کیا۔ ۱۹۲۵-۲۶ء میں جب وہ

---

(۱) پطرس بخاری — از ریحانہ یعقوب — صفحہ ۴

(۲) "سرگزشت" — از سیّد ذوالفقار علی بخاری صفحہ ۴۳ مطبوعہ معارف لمیٹڈ کراچی ۱۹۶۶ء

کیمبرج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے گئے تو اپنے بیوی بچوں کو اپنے چھوٹے بھائی ذوالفقار بخاری کے ہاں چھوڑ گئے۔ چھوٹے بخاری نے سوچا۔ ان کی بیوی اور بخاری کی بیوی دونوں دیسی وضع کی ہیں۔ انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد دونوں خواتین کو انگریزی سکھانے کی غرض سے ایک مشنری اسکول میں داخلہ دلوا دیا۔ اور فیصلہ ہوا کہ گھر میں گفتگو انگریزی زبان میں ہی ہوگی۔ بخاری کی اہلیہ محترمہ اپنے دیور کو ایک دن کسی بات پر اردو میں ڈانٹنے لگیں۔ اس پر چھوٹے بخاری نے انہیں یاد دلایا کہ اگر ڈانٹنا ہی مقصود ہے تو معاہدہ کی رو سے انہیں انگریزی میں یہ "فریضہ" سرانجام دینا ہوگا۔ اس پر محترمہ زور سے بولیں "یُو اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ ای۔ ایف۔ جی۔ ایچ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " اور ایک ہی سانس میں انگریزی کے تمام حروف تہجی فرفر پڑھ گئیں۔ (۱)

انگلستان میں انہوں نے عمانویل کالج کیمبرج میں داخلہ لے کر انگریزی ادب کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ان کے انگریز اساتذہ کی رائے تھی کہ بخاری کا علم اس قدر فراخ اور وسیع و بسیط ہے کہ ایک انگریز کے لئے بھی اتنا علم اس عمر میں رکھنا کم و بیش ناممکن ہے" (۲)

مگر خود بخاری اپنی کارکردگی سے مطمئن نہ تھے۔ وہ کیمبرج کے ابتدائی دور میں امتیاز علی تاج کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ بعض لیکچروں میں تو ان کے قویٰ میں ایک حرکت اور خیالات میں پرواز محسوس ہونے لگتی تھی۔ مگر اکثر لیکچروں میں یہ حالت ہوتی تھی کہ پنسل ان کے ہاتھ میں ہے، آنکھیں لیکچرار کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں۔ ماتھے پر تیوری ہے۔ اور وہ ہمہ تن گوش ہیں۔ ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہے ہیں۔ کچھ لکھنے لگتے ہیں۔ مگر لکھ نہیں سکتے۔ خیالات میں ایک گونج سی ہے۔ جس میں کوئی معنی نہیں ڈال سکتا۔ پطرس کے خیال میں ایسے لیکچر کے خاتمہ پر ان جیسا دل شکستہ، دلگیر انسان کیمبرج میں نہ ہوتا ہوگا۔ وہ اپنی کم مائیگی پر

(۱) "سرگزشت" از سید ذوالفقار علی بخاری
(۲) "پطرس بخاری" از ریحانہ یعقوب ص ۵۔

بے انتہا نادم ہوتے۔ انہیں اس امر کا قلق تھا کہ ایسا انسان جسے ہندوستان میں انگریزی کا ماہر سمجھا جاتا تھا اصل میں اتنا تہی دامن تھا۔ (۱)

پطرس نے اپنے آپ کو نئے ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ اپنا تمام فارغ وقت لائبریری میں گزارنے لگے۔ انہیں اس بات کی زبردست خواہش تھی کہ چاسر سے لے کر ٹامس ہارڈی تک شعر و سخن کی تمام دنیا پر ایک بجلی سی چمکے۔ اور اس کیفیت کی روشن تصویر پوری کی پوری ایک لمحے کے اندر ان کے دل پر نقش ہو جائے۔ پطرس کی یہ خواہش تو پوری نہ ہو سکی۔ مگر ان کی خداداد ذہانت اور ان کی شب و روز کی محنت رنگ لائی اور تھوڑے سے عرصے میں ان کی قابلیت کے جوہر کھلنا شروع ہو گئے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب بینیٹ (Bennet) ڈاکٹر لیوس (Lewis) ٹل یارڈ (Till Yard) لوکس (Lucas) اور آرتھر کوئلر کوچ (Arther Quiller Couch) جیسے شہرہ آفاق اساتذہ سے ان کے ذاتی مراسم پیدا ہو گئے۔ (۲)

پطرس کو کیمبرج یونیورسٹی کی عظمت کا احساس ہمیشہ دامن گیر رہا۔ لکھتے ہیں کیمبرج یونیورسٹی کا ہر فرسودہ پتھر سمجھا جاتا ہے تاریخ انگلیس کی ایک خاموش فصل۔ یہ وہ دارالعوام ہے جہاں جان ہاروڈ (John Harvard) الیور کرام ویل (Oliver Cromwell) سٹرن (Sterne) سیمویل بٹلر (Samuel Butler) بیکن (Bacon) ٹینی سن (Tennyson) تھیکرے (Thackeray) میکالے (Macaulay) لارڈ چیسٹر فیلڈ (Chesterfiald) ولیم پٹ (William Pitt) گرے (Gray) اور ملٹن (Milton) جیسی نابغہ روزگار ہستیاں کسب فیض کر چکی ہوں۔ وہاں اُس بہارستان میں ہندوستان کے ایک مرجھائے ہوئے 'ایک بے رنگ پھول کی کیا حقیقت تھی۔ غریب ماں باپ کا بیٹا' ایک غلام قوم کا فرد' نسیم اور مرزا شوق کی مثنویوں کا پڑھنے والا' فسانہ آزاد کا دلدادہ' جلسے اور سازندے کا

---

(۱) سفر انگلستان نقوش پطرس نمبر صفحہ ۳۹۹

(۲) " " " ۴۳

شوقین، "زمیندار" اوڈ گرو گھنٹال" کا خریدار، ایشیا کے عشقیہ افسانوں میں رچا ہوا مغلیہ عیش و عشرت کا خواہش مند اتحادِ عالمِ اسلامی کے خواب دیکھنے والا۔ میں بھلا کیا حقیقت رکھتا ہوں" (۱)

ویسے اصل بات یہ ہے کہ یہ پطرس کی محض کسر نفسی تھی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انگریز دانشوروں پر ان کی صلاحیتوں کے تمام جوہر آشکارہ ہو چکے تھے۔ اور وہ تہ دل سے انکی صلاحیتوں کے قدر دان تھے۔

کیمرج سے فارغ ہو کر پطرس وطن واپس لوٹے یہاں وہ پہلے سنٹرل ٹریننگ کالج، پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر مقرر ہوئے ان کی رہنمائی میں کالج کی تہذیبی، ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کی رفتار میں بہت ترقی ہوئی۔ ان کی حیثیت محض ایک معلم کی نہ تھی۔ وہ طالب علموں کو صرف پڑھاتے نہیں تھے۔ زندگی میں ان کے مشفق رہنما اور مخلص دوست بھی تھے۔ طالب علموں کی ذہنی استعداد کو ٹٹولنا، انہیں ابھارنا، ان کی صلاحیتوں کو صحیح راہ پر لگانا ان کا اہم فریضۂ حیات تھا اور ایک دلچسپ مشغلہ بھی۔ (۲) اپنے طلبہ میں ادب کا ذوق پیدا کرنے کا جذبہ پروفیسر بخاری میں عشق کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ اس سے نہ وہ بوجھ محسوس کرتے تھے۔ نہ ان کے اپنے مشاغل میں کمی واقع ہوتی تھی۔ بلکہ یہ شوق بڑھتا ہی جاتا تھا، تھیٹر، مشاعرہ، مذاکرہ اور کالج میگزین سے ان کا دلی لگاؤ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں ادب اور زندگی سے گہری شیفتگی تھی۔ کالج کے مشاعروں میں وہ نہ صرف صدارت کرتے بلکہ بھرپور دادِ سخن بھی دیتے۔ اور خود بھی شعر سناتے۔ ڈراموں میں ان کی عملی شرکت نے اس فن کو اس سرزمین میں ایک خاص معیار عطا کر دیا تھا۔

بخاری اپنے طلباء میں تنقیدی شعور پیدا کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ گھسے پٹے، رٹے رٹائے جملوں سے انہیں سخت نفرت تھی۔ اِدھر کسی طالب علم نے کسی مشہور نقاد کے

(۱) سفر انگلستان نقوش پطرس نمبر صفحہ ۳۰۴

(۲) پطرس بخاری مرحوم از صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نقوش پطرس نمبر صفحہ ۸۰

قول کا حوالہ دیا ادھر جھٹ انہوں نے پھبتی کسی۔ منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔

کنہیا لال کپور، اپنے مضمون "پیر و مرشد" میں لکھتے ہیں "میں نے پہلے سہ ماہی امتحان میں متعدد مشہور نقادوں کے فقرے نقل کر دیئے۔ بخاری صاحب نے مجھے صفر نمبر دیتے ہوئے لکھا۔ "آپ نے جگہ جگہ ایف۔ ایل لوکس اور پروفیسر کِلر کوچ کے اقوال نقل کر دیئے ہیں۔ یہ دونوں کیمبرج میں میرے استاد تھے۔ یقیناً میں اس قابل نہیں کہ اپنے استادوں کا ممتحن بنوں۔ مجھے تو آپ کا امتحان لینا ہے"۔

استاد شاگرد کا ذکر چل نکلا ہے۔ تو ان کے ہونہار شاگرد کنہیا لال کپور کے تاثرات کی ایک جھلک دیکھتے چلیں۔ کپور لکھتے ہیں، بخاری مرحوم حاضری لئے بغیر لیکچر شروع کیا کرتے۔ اور عموماً لیکچر سے پہلے اپنے شاگردوں سے دو ایک چونچیں لڑایا کرتے تھے۔ لیکچر کسی کتاب یا نوٹس کی مدد کے بغیر دیتے تھے۔ تلفظ ایسا کہ انگریزوں کو رشک آتا تھا۔ فرسودہ یا روایتی انداز بیان سے انہیں چڑ تھی۔ غلطی سے بھی عامیانہ فقرہ ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ ڈرامہ پڑھانے میں انہیں خاص کمال حاصل تھا۔ ہملیٹ (Hamlet) پڑھا رہے ہوں تو چہرے پر وہی تاثرات پیدا کر لیں گے جو موقع محل کی عکاسی کرتے ہوں۔ کنگ لیئر (King Lear) پڑھاتے تو معلوم ہوتا طوفانوں میں گھرا ہوا بوڑھا شیر غرا رہا ہے۔ شیکسپیر کے مشہور کرداروں کی تقریریں انہیں زبانی یاد تھیں"۔

کنہیا لال کپور آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ایک بار فلسفی برگسان (Bergson) کی ایک کتاب (Laughter) کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کلاس کو بتایا۔

"انسان ہی صرف ہنسنے والا جانور ہے"

اس پر کپور بولے "جناب، بندر بھی ہنستا ہے"، پطرس کہاں چوکنے والے تھے۔ ہنس کر فرمانے لگے "کیونکہ وہ انسان کا جدِ امجد ہے"۔

بخاری صاحب، مزاحیہ تقریر کے فن میں امام کا درجہ رکھتے تھے۔ کپور راوی ہیں۔ کہ

ایک بار یونیورسٹی ہال میں ایک ادبی مباحثہ ہو رہا تھا۔ موضوعِ زیرِ بحث تھا (The Proper Study of Mankind is Women) اس موقع پر بخاری صاحب نے علم و حکمت کے موتی بکھیرتے ہوئے یوں لب کشائی کی ۔

" حضرات ! میں بدقسمتی سے پروفیسر واقع ہوا ہوں۔ جس کالج میں پڑھاتا ہوں وہاں مخلوط تعلیم کا رواج ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ کلاس روم میں طلباء کی توجہ کا مرکز صنفِ نازک ہی ہوتی ہے۔ کوشش کے باوجود میں طلباء کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا۔ اور بسا اوقات مجھے صنفِ نازک پر رشک آنے لگتا ہے۔ طلباء بخوبی سمجھتے ہیں کہ صنفِ نازک ہی مطالعہ کا اصل موضوع ہے "

بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا " صنفِ نازک کے مطالعہ کے بغیر سائنس کا مطالعہ ناممکن ہے۔ کیا آپ Magnetism (مقناطیسیت) کا مطالعہ صنفِ نازک کے بغیر ممکن سمجھیں گے۔ جب کہ آپ جانتے ہیں کہ عورت سے زیادہ پُرکشش ہستی خداوند تعالیٰ نے پیدا نہیں کی۔ کیا آپ Heat (حرارت) کے مطالعہ میں عورت کو نظرانداز کر سکتے ہیں۔ جبکہ آپ جانتے ہیں کہ محفلوں کی گرمی، عورت کی موجودگی کی مرہونِ منت ہے۔ کیا آپ برقیت (Electricity) کا مطالعہ کرتے وقت عورت کو نظرانداز کر سکتے ہیں۔ جبکہ آپ کو معلوم ہو کہ حوا کی بیٹیاں، بادل کے بغیر بجلیاں گرا سکتی ہیں ؟

پھر بحث کو نیا رخ دیتے ہوئے کہنے لگے، صنفِ نازک آرٹ کے مطالعہ کیلئے ناگزیر ہے۔ اگر لیونارڈو، رافیل اور مائیکل اینجلو نے عورت کے خط و خال کو قریب سے نہ دیکھا ہوتا۔ تو کیا وہ ان لافانی تصاویر اور مجسموں کی تخلیق کر سکتے، جن کا شمار عجائباتِ عالم میں ہوتا ہے۔ کیا کالی داس، شکنتلا، شیکسپیئر، روزالینڈ اور دانتے، بیٹرس کا تصور بھی ذہن میں لا سکتے اگر انہوں نے صنفِ نازک کے مطالعہ میں شب و روز نہ گزارے ہوتے ... صنفِ نازک نے موسیقاروں سے ٹھمریوں اور دادروں، شاعروں سے مثنویوں اور غزلوں اور رقاصوں سے کتھک اور کتھا کلی کی تخلیق کرائی ۔ آج فنونِ لطیفہ ختم ہو رہے ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم

مطالعہ کے اصلی موضوع سے بھٹک رہے ہیں"

مرحوم تقریر نہیں، سحر کیا کرتے تھے۔ کپور ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ ایک بار ڈی اے وی کالج میں پطرس گالزوردی کے ناول (A Man of Property) پر لیکچر دے رہے تھے یہیں انگریزی فکشن پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا جب وہ گالزوردی کے ناول کی وضاحت کر رہے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ جیسے خود مصنف اپنی تخلیق کا تجزیہ کر رہا ہو۔

دوران تقریر بجلی غائب ہوگئی۔ بخاری گھپ اندھیرے میں ہی شگفتہ انداز میں تقریر کرتے رہے۔ طلبا اندھیرے میں ان کے فقرے نوٹ کرنے کی کوشش میں محو رہے۔ کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد بتیاں روشن ہوئیں۔ تقریر کے بعد طلبا کا رد عمل یہ تھا کہ جو باتیں ان کے پروفیسر دو سال میں نہیں بتا سکے تھے۔ وہ بخاری صاحب نے ایک گھنٹہ کے دوران بتادی تھیں۔

پطرس سیمنار کے پیریڈ میں ہندوستانیوں کی عادات پر دلچسپ تبصرہ کیا کرتے تھے۔ مشتے نمونہ از خروارے۔

" ہم ہندوستانی بھی عجیب مخلوق ہیں، انگلینڈ میں اگر کسی کے گھر موت واقع ہو جائے تو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ یہاں کسی کا دور دراز کا رشتہ دار اللہ کو پیارا ہو جائے تو ساری رات دھاڑیں مار مار کر ہمسایوں کے علاوہ گلی، محلہ والوں کی نیند حرام کر دیتا ہے"

" شور و غل کا ہماری زندگی میں کتنا دخل عمل ہے۔ انگلینڈ اور فرانس میں سڑک پر چلتے ہوئے لوگ اتنی دھیمی آواز میں بولتے ہیں، گویا کانا پھوسی کر رہے ہوں۔ ہم ہندوستانی مدھم کی بجائے پنچم میں باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ بخدا ہم بولتے نہیں، چلاتے ہیں"

" ہم ہندوستانی جب تقریر کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے گھر والوں سے لڑ کر آ رہے ہوں۔ اور سامعین پر اپنا غصہ اتار رہے ہوں۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ ماتمی قرار داد بھی ہم اس انداز میں پیش کرتے ہیں، جیسے ہمسایہ ملک سے اعلان جنگ کر رہے ہوں"

"مبالغہ آمیزی ہماری طبیعت کا شعار بن چکی ہے۔ یہاں ہر کانفرنس "آل انڈیا" یا "بین الاقوامی" ہوتی

ہے۔ چاہے شرکت کرنے والوں کی تعداد ایک درجن کیوں نہ ہو۔ چند دن ہوئے میں نے موچی دروازے کے اندر ایک دکان دیکھی جس میں ایک ٹوٹا ہوا ہارمونیم اور خستہ حال طبلہ پڑا ہوا تھا۔ سائن بورڈ پر لکھا تھا "انٹرنیشنل اکیڈمی آف میوزک اینڈ ڈانسنگ" International Academy of Music and Dancing

"ہندوستانی موسیقی میں سوز ہے، جوش نہیں۔ کیمبرج میں ایک بار میں نے اپنے استاد کلر کو پکے گانوں کے چھ سات ریکارڈ سنوائے۔ اس کے بعد ان کی ہندوستانی موسیقی کے بارے میں رائے دریافت کی۔ نہایت سنجیدگی سے کہنے لگے۔ بور کرنے کے لئے ایک ہی ریکارڈ کافی تھا۔ آپ نے چھ سات سنوانے کا ناحق تکلف کیا (۱)

صوفی تبسم لکھتے ہیں کہ پروفیسر بخاری اپنے روزمرہ مشاغل میں خواہ وہ فرائض منصبی سے تعلق رکھتے ہوں یا نجی ہوں۔ ایسے ہی مستعدی سے کام لیتے تھے۔ قدرت نے انہیں غیر معمولی ذہانت عطا کی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی معاملہ فہمی اور تجزرسی اس ذہانت کو اور بھی چمکاتی تھی۔ وہ کسی کام کو شروع کرنے سے پہلے اس کے تمام امکانی پہلوؤں کو بھانپ لیتے تھے۔ اور اس کے دور رس نتائج پر نظر رکھتے تھے۔ وہ معمولی اقدام کے لئے بھی کئی دنوں تک غور کرتے رہتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے سوچتے تھے۔ دوسروں سے مشورہ بھی لیتے تھے۔ اور اس مشورہ طلبی میں ایسے حسنِ تدبر سے کام لیتے تھے کہ بات بھی سلجھ جائے اور کسی کو اصل راز کا پتہ بھی نہ چلے۔ جب ذہنی جائزہ لینے کے بعد انہیں پورا اطمینان ہو جاتا تب وہ قدم اٹھاتے۔ اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کام کی تکمیل کے درپے ہو جاتے تھے۔

کام کی تکمیل کے لئے دوسروں سے مدد لینے میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ وہ اپنے عملی اقدام کا پرچار بڑی خوش اسلوبی سے کرتے تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ کسی کام کی صحیح تکمیل کے لئے انسان میں محض شوق نہیں بلکہ چسکا ہونا چاہیئے۔ چنانچہ وہ جب بھی کسی کام کو کرتے تو ایسے ذوق و شوق سے کرتے کہ گویا انہیں اس کام کا چسکا ہے۔

انہوں نے ایک بے چین طبیعت پائی تھی۔ ان کا دماغ ان کے جسم سے اور ان کا جسم ان کے دماغ

(۱) "پیر و مرشد" از کنہیا لال کپور نقوش پطرس نمبر صفحہ ۷۷

سے زیادہ تیز کام کرتا تھا۔ ان کے ذہنی اطوار اور عملی رفتار ہمیشہ ہم آہنگ رہتے۔ اس لئے انتہائی مصروفیتوں میں بھی ان کی طبیعت پر کوئی ناگوار بوجھ نہ پڑتا تھا۔ بلکہ تکمیل کار ان کے لئے خاص لذت اندوزی کا سامان مہیا کرتی تھی۔ (۱)

بخاری صاحب کا قول تھا کہ زندگی میں الجھنا ہو تو کسی بڑے مسئلے پر الجھنا چاہیئے۔ اور اپنے سے بڑے آدمی کے ساتھ الجھنا چاہیئے۔ ورنہ مزا نہیں آتا۔ انسان کی قوتیں اور کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ بظاہر ٹکراؤ ایک ناگوار سی شے ہے اور کام کی تکمیل میں ایک رکاوٹ سا نظر آتا ہے۔ لیکن جب اس کی بنیاد کسی بڑے اصول پر ہو اور ٹکرانے والے اہل لوگ ہوں تو اس کے مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ بخاری صاحب کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ وہ ہمیشہ ایسی رکاوٹوں سے خوش ہوتے تھے۔ رکاوٹوں سے ان کی طبعی صلاحیتیں اور ابھرتی تھیں ان کا بڑا کمال یہ تھا کہ وہ رکاوٹوں سے عہدہ برآ ہوتے وقت کبھی تھکن یا تلخی محسوس نہیں کرتے تھے اور تو اور خود ان سے ٹکرانے والا جب ان سے شکست کھاتا تھا تو اسے اپنی شکست کا اتنا احساس نہیں ہوتا تھا جتنا ان کی عظمت اور برتری کا (۲)

بظاہر بخاری صاحب "پورے صاحب" دکھائی دیتے تھے، ان کی وضع قطع، ان کا لباس، ان کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے، باتیں کرنے سے یورپینی انداز ٹپکتے تھے، وہ مشرقی طرز بود و باش پر اکثر پھبتیاں کستے رہتے تھے۔ ان کے ساتھ بازار میں گھومنے جانے والے اس بات پر شاہد ہیں کہ انہیں اہل وطن کی کوئی ادا پسند نہ تھی۔

"وہ دیکھو، تہبند کے ساتھ انگریزی قمیض"

"سبحان اللہ، چپلی کے ساتھ پتلون"

"ململ ٹائی اور شلوار کیا کہنے"

"یہ شخص بازار میں کھڑا کباب کھا رہا ہے"

"یہ دیکھئے اس نے بائیسکل بازار میں بغیر اشارے کے گھما دی"

---

(۱) پطرس بخاری مرحوم از صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نقوش پطرس نمبر صفحہ ۱۳

(۲) " " " " ۸۳

"اور یہ چار آدمی صف باندھے چلے جا رہے ہیں۔ موٹر کہاں سے گزارں"

لیکن اصل میں بات یہ تھی کہ دور سے دیکھنے والوں کو پطرس کسی یورپی یونیورسٹی کے ایک بے سجائے مکمل پروفیسر نظر آتے۔ مگر جب کبھی ان کے پاس بیٹھ کر گفتگو سننے کا موقع ملتا تو ان کے برجستہ مسکراہٹ لئے ہوئے مادری زبان میں بے ساختہ جملے ظاہر کرتے کہ ان کا نہایت مکمل مغربی لباس ان کی مشرقیت پر ایک ملمع ہے اور ان کی مشرقیت کے جوہر آہستہ آہستہ گفتگو کے مدارج طے کرتے کرتے واضح ہوتے چلے جاتے۔ بلکہ ان کی تمام انگریزی اور انگریزیت ان کی مشرقیت کے تابع نظر آنے لگتی۔ ان کی ذات مغرب و مشرق کا تضاد نہیں، بلکہ ایک لطیف امتزاج پیش کرتی تھی۔ ان کی مشرق مزاجی کو دیکھنا ہو تو انہیں گھر کی چار دیواری میں دیکھئے۔ جہاں ہر شے مغربی انداز میں جلوہ گر ہے۔ لیکن جہاں زندگی کی حرکات خالص مشرقی فضا میں سانس لیتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہی بے پروا، لاابالی پن، وہی بے تکلف گفتگو، وہی خلوص آمیز میل ملاپ۔ آغا بابر درست فرماتے ہیں کہ پطرس مرحوم نے بھرپور زندگی گزاری اور وقت کے ایک ایک لمحے سے اس کا اس طرح رس نچوڑا کہ وقت اپنی تہی دامنی پر نادم دکھائی دینے لگتا تھا

صوفی تبسم کے بقول کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ دن بھر اتنی باقاعدگی اور مستعدی سے مشین کی طرح مسلسل کام کرنے والا رات کو کیونکر جاگتا ہوگا۔ رات کے دس گیارہ بجے کے بعد گھر سے گھومنے کیلئے نکلنا۔ ان کا روزمرہ کا شیوہ بلکہ معمول تھا۔ کوئی مقصد، کوئی منزل مقصود نہیں۔ محض گھومنا اور گھومنا۔ اور گھومتے گھومتے کسی سنسان سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر گھنٹوں گپیں ہانکنا، ان کی تفریح، جس میں ان کے تمام ہم قدم دوست برابر کے شریک ہوتے تھے۔ مجال نہیں کہ کوئی شب خیز اس ثواب سے محروم رہ جائے۔ بیدل کے دقیق اشعار، شیکسپیر کے ڈرامے، ایلیٹ کی مجرد نگاری، منٹو کے افسانے، انہی خوش گپیوں کے تحت میں آجاتے تھے۔

غلام رسول مہر کے بقول بخاری جو کچھ لکھتے یا بولتے تھے۔ اس میں تکلف بالکل نہ ہوتا تھا۔ تاہم ان کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی نادر خوبی ضرور ہوتی تھی۔ پھر وہ فطری صلاحیت، مزاح کی بنا پر اس میں خاص دلآویزی پیدا کر دیتے تھے۔ وہ بحث و مناظرہ سے پرہیز کرتے تھے۔ جو موضوع زیر بحث آتا، اس

کے متعلق دو یا تین باتیں بتے کی ایسے انداز میں کہہ دیتے' جیسے کوئی بے تعلق سا آدمی کسی حقیقت کا اظہار کر دیتا ہے۔ اور دوسرے معاملے پر گفتگو شروع کر دیتے۔ کسی کی کم علمی یا واقفیت کی فرومائیگی کا مذاق انہوں نے کبھی نہ اڑایا۔ ساتھ ہی وہ کبھی چھوٹے سے بڑے آدمی سے بھی مرعوب نہ ہوتے تھے۔ ان کے دل میں سب کے لئے محبت اور الفت موجزن تھی۔ عداوت کسی سے نہ تھی۔ وہ ایک نادرالوجود انسان تھے۔ ہر شخص سے اسکے مناسب حال گفتگو کرتے تھے' مزے کی بھی' پتے کی بھی۔ وہ مرجع خلائق تھے۔ لیکن ان کا اپنا انداز یہ تھا کہ مشاہیر کے حلقوں میں یونہی گھومتے پھرتے نظر آتے' جیسے ان پر کرم کرنے نکل آئے ہوں۔ بیشتر وقت وہ عام لوگوں اور اپنے ساتھیوں کے حلقے میں مگن رہتے تھے۔ بخاری بقول رشید احمد صدیقی ایسے یوسف تھے جو کبھی بے کارواں نہیں رہے۔

بڑے سے بڑے ذہنوں سے ٹکر لینے اور چھا جانے میں بخاری کا جواب نہ تھا۔ خواہ وہ محفل علم و دانش کے اکابر کی ہو۔ خواہ بے تکلف احباب اور بے فکروں کی۔ خواہ سیاسی شاطروں کی بات کوئی ہو۔ موقع کیسا ہی ہو۔ بخاری نہ مشتعل ہوتے تھے۔ نہ مایوس' نہ متفکر' توازن اور تفنّن کی فضا برابر قائم رکھتے۔ کبھی برجستہ فقروں سے' کبھی اپنے مخصوص قہقہوں سے' لیکن اس دوران مقصد کی طرف سے کبھی غافل نہ ہوتے۔ اور جہاں تہاں ایسے نکتے پیدا کرتے رہتے' کہ حریف کو قائل ہونا پڑتا کہ بخاری سے مفر نہیں۔ مسئلہ کتنا ہی نازک اور پیچیدہ کیوں نہ ہو۔ بخاری اپنی بات بہت کچھ منوا لیتے تھے۔ کبھی ایک زیرک وکیل کی طرح' کبھی ایک آزمودہ جرنیل کی مانند' حریفوں کو پسپا ہوتے ہی دیکھا۔ اکثر لاجواب ہو کر۔ کہیں ہنسی خوشی اور کہیں بے سوچے سمجھے بھی۔

انگریزی شعر و ادب پر ان کو جتنا غیر معمولی عبور تھا وہ اظہر من الشمس ہے۔ لیکن ان کے ذوق و ذہانت کا پورا اندازہ اس وقت ہوتا ہے۔ جب ہم ان کے اردو مضامین میں انگریزی کی وہ جاندار' گوارا' ٹھہری ہوئی اور خوش آئند فضا محسوس کرتے ہیں۔ جو کسی اور کے یہاں نہیں ملتی۔ ان کے توسل سے انگریزی کی جھلک اردو میں دیکھ کر ان کی اردو شناسی اور انگریزی دانی کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

فیض لکھتے ہیں کہ بخاری کا حلقۂ یاراں بہت وسیع تھا ان کے دوستوں میں سے کسی کو یہ حوصلہ نہ تھا کہ وہ ان کے اوقات میں مداخلت کرے یا ان کی فرمائش کے بغیر ان کی کسی مصروفیت میں حارج ہو۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ بخاری صاحب لباس بدلتے ہیں تو ساتھ ہی شخصیت بھی بدل لیتے ہیں۔ اصل میں یوں نہ تھا بلکہ یہ ان کے بہت ہی بنے تُلے قاعدے اور سلیقے کا اظہار تھا کہتے تھے تکلف میں تضیع اوقات تک تو خیر جائز ہے لیکن تکلف میں بور ہونا کسی صورت میں جائز نہیں۔

ان کا دوسرا قاعدہ یہ تھا کہ کام کے وقت ڈٹ کر قاعدے سے کام کرو۔ تاکہ کام کے بعد ڈٹ کر بے قاعدگی کر سکو۔ ان کی خوش طبعی اور اپج کسمساتی رہتی تھی۔ فیض لکھتے ہیں "ایک بار میں نے دیکھا کہ گھر میں آتشدان کے سامنے بہت سی فائلیں لیے بیٹھے ہیں۔ اور فائلوں میں سے کاغذات نکال کر آگ میں جھونکے جا رہے ہیں" استفسار پر کہنے "دیکھو۔ اس کو انگریزی میں (Quick Disposal) کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان فائلوں میں محض خرافات بھرا ہے۔ اس خرافات سے چھٹکارا پانے کی واحد صورت یہ ہے کہ اس کا نام و نشان صفحۂ دفتر سرکار عالی مدار سے محو کر دیا جائے"

بخاری جس زمانے میں انگریزی کے استاد بھی تھے اور پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے سیکرٹری بھی۔ ایک دن فیض اپنے چند دوستوں کے ہمراہ ان کے ہاں ملنے گئے۔ بخاری نے انہیں ایک ضخیم فائل دکھائی جس کے سرورق پر لکھا تھا۔ " Office Cat " یعنی دفتر کی بلی "پطرس نے اس موقعہ پر جو قصہ بیان کیا۔ وہ آپ بھی انہی کے الفاظ میں سنیئے :

"قصہ یوں ہے۔ کہ ایک دن میرے کمرے میں ایک بلی آ گئی۔ مجھے اچھی لگی۔ میں نے کسی سے کہا، اسے تھوڑا سا دودھ لا دو۔ پھر وہ بلی ہر روز آنے لگی اور ہر روز اسے دودھ بھی ملنے لگا۔ بینے کے آخر میں سپرنٹنڈنٹ صاحب نے دفتر کے اخراجات کا بل مجھے بھیجا تو اس کے ساتھ ایک تحریری سوال بھی منسلک تھا۔ کہ بلی کے دودھ پر چودہ روپے ساڑھے چھ آنے کی رقم صرف ہوئی ہے۔ وہ کس مد میں جائے گی ؟ میں نے لکھ بھیجا (Contingency) یعنی متفرق خرچ میں ڈال

دو. تھوڑے دنوں کے بعد اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر نے بل لوٹا دیا۔ اور یہ تحریری فہمائش کی کہ (Contingency) کی مد دفتر کے ساز و سامان اور دیگر غیر جاندار اشیاء کے لئے مخصوص ہے۔ یعنی جاندار شے ہے اور اس کے اخراجات (Contingency) میں شامل نہیں کئے جا سکتے۔ اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھ سے تحریری ہدایت طلب کی۔ میں نے لکھا کہ جاندار، غیر جاندار کا قصہ ہے تو یہ خرچ (Establishment) یعنی عملے کی مد میں ڈال دو۔ دوبارہ بل خزانے کو روانہ ہوا۔ اور تھوڑے دنوں میں لوٹ آیا۔ اب کے ایک طویل مراسلے میں یہ استفسارات تھے کہ اگر یہ خرچ عملے کی مد میں جائے گا تو واضح کیا جائے کہ اس رقم کو تنخواہ تصور کیا جائے یا کہ الاونس؛ اگر تنخواہ ہے تو بموجب قاعدہ نمبر فلاں فلاں، فلاں دفتر کی پیشگی منظوری درکار ہے۔ اور اگر یہ الاؤنس ہے تو بموجب قاعدہ فلاں فلاں، فلاں افسر سے اس کی تصدیق لازمی ہے... چنانچہ یہ فائل چھ مہینے سے چل رہی ہے اور اس میں ایسے ایسے باریک نکتے بیان ہوئے ہیں کہ اندازہ نہیں"

فیض آگے چل کر لکھتے ہیں۔ کہ اس کے بعد لطرس نے ایک اور فائل نکالا۔ سرورق پر یہ عبارت درج تھی، خط و کتابت مابین پروفیسر اے ایس بخاری سیکرٹری ٹیکسٹ بک کمیٹی، پروفیسر اے ایس بخاری شعبۂ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور۔

خطوں کے متن کی ایک جھلک بھی ملاحظہ ہو۔

پہلا خط، بنام پروفیسر اے ایس بخاری شعبۂ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور

جناب والا!

ایک یاد دہانی کے لئے عرض ہے کہ گزشتہ ماہ آپ کو پانچ کتابیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔ ریویو کی غرض سے ارسال کی گئی تھیں۔ لیکن ریویو ابھی تک موصول نہیں ہوئے۔ مہربانی سے جلد توجہ فرمایئے۔

آپ کا نیازمند اے ایس بخاری

اس کے بعد یاد دہانی کے دو خط اور ہیں اور تیسرا خط یہ ہے :

از جناب پروفیسر اے ایس بخاری سیکرٹری ٹیکسٹ بک کمیٹی لاہور بنام پروفیسر اے ایس بخاری شعبۂ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور

جناب والا !

بحوالہ خط نمبر فلاں فلاں، آپ کو ٹیکسٹ بک کمیٹی کی طرف سے جو پانچ کتابیں ارسال کی گئی تھیں (تفصیل درج ذیل ہے) ان میں سے تین کے ریویو وصول ہو گئے ہیں۔ جس کے لئے کمیٹی آپ کی ممنون ہے۔ لیکن کمیٹی توجہ دلانا چاہتی ہے کہ انتہائی اصرار کے باوجود آپ نے دو کتابوں (یعنی فلاں اور فلاں کتاب) کے بارے میں ابھی تک اپنی رائے تحریر نہیں فرمائی۔ کمیٹی اس تاخیر کی وجوہ سمجھنے سے قاصر ہے، آپ کو تنبیہہ کی جاتی ہے کہ اگر فلاں تاریخ تک آپ کی رائے وصول نہ ہوئی تو آپ کا نام ریویو کرنے والوں کی فہرست میں سے خارج کر دیا جائے گا۔

آپ کا نیازمند اے ایس بخاری

اور اس کا جواب یہ ہے :

منجانب اے ایس بخاری وغیرہ بنام اے ایس بخاری وغیرہ

جناب والا ! بحوالہ خط فلاں، فلاں، بقیہ ریویو ملفوف ہیں۔ میں یہ گوش گزار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کے خط کا آخری پیراگراف انتہائی قابل اعتراض ہے۔ سینئر (SENIOR) افسروں سے خطاب کا یہ انداز قطعی غیر موزوں ہے (1)

المختصر، بخاری جیسے سیماب صفت انسان کا دماغ اس کے جسم سے اور اس کا جسم اس کے دماغ سے زیادہ تیز کام کرتا ہے۔

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی، کبھی پیچ و تاب رازی

---

(1) کہ گوہر مقصود گفت گوست فیض احمد فیض نقوش پطرس نمبر صفحہ ۵۹

پطرس - فکروفن

پروفیسر بخاری نے تمام عمر علم کا تعاقب کیا اور بصارت پا کر آسمان کی بلندیوں میں چھپ گئے۔ انہوں نے بہت کم لکھا۔ مگر ان کی یہ کمی دوسرے انشا پردازوں کی بھاری بھرکم تحریروں سے متاثر نہیں ہوئی۔ وہ اس نکتہ سے خوب آگاہ تھے کہ انشا میں اصل چیز ندرت اور نفاست ہے۔ بہتات نہیں۔ پطرس نے انگریزی ادب کی روح کو مشرقی مزاج دے کر اپنی نگارش میں ایک خاص لطف نکھار اور رکھ رکھاؤ پیدا کر لیا تھا۔ ڈاکٹر احسن فاروقی درست کہتے ہیں کہ انہیں بحیثیت انشا پرداز اتنی قوت حاصل تھی کہ ہر موضوع پر بے تکلف لکھ سکتے تھے۔ اور شروع سے آخر تک اپنا رنگ بھی برقرار رکھ سکتے تھے۔ "ان کا کام کھیل دکھانا تھا، لفظوں کا کھیل، فقروں کا کھیل، چست جملوں کا کھیل، وِٹ (Wit) کا کھیل۔ مگر یہ اس کا خاص کھیل نہیں۔ اس کا کھیل پک کا کھیل ہے۔ جو توں کا کھیل، ڈرامائی حالات کا کھیل۔ ہر مضمون یہی کھیل دکھاتا ہے۔"

پطرس کی دنیا محدود نہ تھی۔ ان کا مزاج مشرقی، ذہن مغربی اور طرزِ فکر عالمگیر تھا۔ انہوں نے جو کچھ لکھا، سوچ سمجھ کر لکھا۔ ان کی ہر تخلیق ایک کارنامہ ہے۔ ان کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت اس کا انوکھا پن ہے۔ وہ پچیس تیس بلکہ چالیس پچاس شعر کہتے۔ دو ایک دوستوں کو ایک ایک کر کے کبھی ایک کبھی دوسرا شعر سناتے۔ ان کی ناقدانہ رائے سے استفادہ کرتے جو شعر معیار پر پورا اترتا، اسے محفوظ رکھ لیتے۔ اور باقی کلام کو اس طرح بھول جاتے جیسے اسے کبھی تخلیق ہی نہ کیا ہو۔

بخاری، طنز و ظرافت میں یکتا تھے۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ طنز و ظرافت آسانی سے ہاتھ آجانے والے، لیکن پُرپیچ خطرناک آلے ہیں۔ سستی طنز و ظرافت بہت مہنگی پڑتی ہے۔ یعنی احتیاط

سے کام نہ لیا جائے تو طنز و ظرافت سے کام لینے والے خود طنز و ظرافت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مضحک کو مضحک دکھانے بتانے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ یہ سستا اور فضول کاروبار ہے شخصیت کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ معمولی کو غیر معمولی بنا دے۔ یعنی طنز و ظرافت کے پہلو وہاں دیکھ لے۔ جہاں کسی دوسرے کا ذہن آسانی سے نہ پہنچ سکتا ہو۔ طنز و ظرافت کے یہی نمونے فنکار کی شخصیت کی کشید ہوتے ہیں اور اچھے ادب اور اچھے ذہنوں میں جگہ پاتے ہیں۔

بخاری کی ظرافت بندھے ٹکے تفریحی موضوعات، روایتی کرداروں اور لفظی ہیر پھیر سے بے نیاز ہوتی ہے، ہر جگہ، ہر بات میں انہوں نے خوش طبعی اور زندہ دلی کا پہلو نکالا ہے۔ جیسے صحرا کو مسکرا کے گلستان بنا دیا ہو۔ ان کی ظرافت عام طور سے منفرد ہوتی ہے مرکب نہیں وہ ظرافت کو ظرافت کے سہارے قائم رکھتے ہیں اور اس سے ہر مقصد حاصل اور ہر مشکل حل کر لیتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کا خیال درست ہے کہ بخاری نے ظرافت کو زمینی و زمانی ہی رکھا۔ وہ اسے ماورائی اور لا مکانی بنانے کی فکر میں نہیں پڑے۔ وہ مزے کی باتیں مزے سے کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پڑھنے والوں کا اعتماد بہت جلد حاصل کر لیتے ہیں۔ ترشے ہوئے فقروں اور ڈرامائی انداز سے عامی اور عالم دونوں کو مسرور کرنے اور مسخر کرنے کا سلیقہ جتنا بخاری کو آتا تھا کسی اور کے ہاں کم نظر آتا ہے۔ طباعی اور زندہ دلی ان کی رگ و پے میں ساری تھی۔ اور طرح طرح سے جلوے دکھاتی تھی۔ وہ لطیفہ خوان نہ تھے۔ لطیفہ طراز تھے۔

صوفی تبسم لکھتے ہیں کہ پطرس کے مضامین بخاری کی مزاحیہ طبیعت کے آئینہ دار ہیں۔ مزاح نگاری بڑی ہلکی پھلکی شے ہے۔ لیکن ایک لطیف شے کو پیدا کرنے کے لئے ایک بڑی شخصیت کی ضرورت ہے جب تک کسی شخص میں غیر معمولی ذہانت، عمیق مشاہدہ کی عادت اور شگفتہ طرز بیان کی قوت نہ ہو۔ وہ کامیاب مزاح نگار نہیں بن سکتا۔ انسانی اعمال میں بعض حرکات بڑی مضحکہ خیز ہوتی ہیں لیکن ہر آنکھ انہیں نمایاں طور پر نہیں دیکھ سکتی۔ ایک مشاہدہ کار انسان، انہیں بروئے کار لاتا ہے۔ اور ان کا اظہار لطیف اور شگفتہ انداز میں اس طرح کرتا ہے کہ وہ تحت الشعور سے ابھر کر اجاگر

ہو جاتی ہیں۔ اور ہم انسانی لغزشوں کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں۔ بخاری کی نظر بڑی وسیع اور عمیق تھی اور پھر اسے بیان پر قدرت حاصل تھی۔ اس لئے وہ بے ساختہ ان حرکات کو دیکھتے، سمجھتے اور چہکاتے رہتے تھے۔

محمد احسن فاروقی کا ایمان ہے کہ کوئی سچا مصنّف خود نہیں لکھا کرتا۔ قلم تو اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ مگر چلاتی اس کو کوئی روحانی چیز ہے۔ اور یہ روحانی چیز اپنی موجِ خرام سے ایسے گل کتر جاتی ہے، جن کا احساس مصنّف کے شعور کو بھی بعد ہی میں شاید کبھی ہوتا ہے۔

ہومر کی روح جب پطرس کا قلم چلا رہی تھی تو اس نے حقیقت کو حق بجانب ثابت کر دیا۔ یہ روح جسے یونانی علم اصنام میں مومس (Momus) کہتے ہیں۔ یہی کرتی ہے۔ حقیقت اور حماقت کو اس طرح گڈمڈ کرتی ہے کہ نہ حقیقت کھلے نہ حماقت ثابت ہو۔ یہ روح ہمارے بھکڑ بازوں سے کبھی چھو کر نہیں گزری۔ ان کی حماقتوں کو پڑھیئے۔ ہنسی کی ایک لہر دوڑے گی۔ مگر ذرا غور کیجئے تو ان کی حماقت، حماقت ہی رہ جائے گی۔ پطرس تو مومس سے ہمکنار ہے۔ اس کے خامے کی آواز نوائے مومس ہے۔

اثر لکھنوی کے خیال میں پطرس مزاح نگاری کے جملہ لوازم سے واقف تھے اور انہیں حسب ضرورت استعمال کرنے کا سلیقہ بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ نقطہ تراشی ہو یا پیروڈی، مضحک صورتحال ہو یا کرداری بوالعجبیاں، وہ سب پر ماہرانہ دستگاہ رکھتے تھے۔

پطرس نے مزاح کے تاثر کو گہرا کرنے کے لئے ایک خاص طریقہ اپنایا۔ کہ اپنی ذات کو ہدف مزاح بنایا۔ یہ طرز خاص کچھ ان ہی سے مخصوص ہے۔ دیگر مزاح نگاروں نے دوسروں کی ہنسی اڑائی۔ جبکہ پطرس اپنی ہنسی اڑاتے ہیں، اور یہ عالی ظرفی کی بات ہے۔ چنانچہ کتوں کا خوف ہو یا ہوسٹل میں سحر خیزی۔ لیڈری میں انڈے کھائے ہوں یا بیوی سے وفاداری بشرطِ استواری والا معاملہ، پبلک سے مقابلہ کتب بینی ہو یا سائیکل پر سوار ہو کر کارٹون بننا۔ پطرس ہر معاملہ میں اپنا مذاق اڑاتے نظر آتے ہیں۔ اسی خصوصیت نے ان کے مزاح سے طنز کی زہرناکی کو ختم کرکے خالص اور

نقرے مزاح کو جنم دیا ہے۔ پطرس اپنے اندازِ مزاح کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔

پطرس کی ظرافت میں خوشگوار طنز اور اس طنز میں گہری انسانیت ہے۔ پطرس کی طنز عموماً متوسط طبقے کے نوجوانوں سے متعلق ہے۔

"ہاشل میں پڑھنا" نامی مضمون میں پطرس نے جس عمدگی سے طالب علموں کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے اور جو خاکہ کھینچا ہے، وہ صرف انہی کا حصہ ہے۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اور پھر ــ کمال یہ ہے کہ ایک دیہاتی اور قصباتی طالب علم کی پوری پوری نمائندگی کی ہے۔ یہ سارا مضمون 'معصومانہ ذہنیت کا مظہر اور طالب علمانہ کش مکش ذہنی کا آئینہ ہے۔ بقول تمکین کاظمی' پطرس نے اس مضمون میں جگہ جگہ ایسی "پچی کاری" کی ہے کہ اس کی جوت سے آنکھیں منور ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ آخری فقرہ تو لاثانی ہے۔

"یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمایئے۔ کہ ہمیں پاس
کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے"

ہاشل میں پڑھنے والے کے گھر والوں کو دیکھئے۔ کھاتے پیتے مسلمان لڑکے کو تعلیم دلاتے ہیں مگر تعلیم کے مقصد اور تعلیمی اداروں کے حالات سے بالکل بے بہرہ ہیں۔

نیاز فتح پوری نے لکھا ہے کہ پطرس کی مزاح نگاری بڑی حد تک مغربی رنگ کی ہے جس میں واقعہ اور اندازِ بیان دونوں سے مضحک کیفیات پیدا کی جاتی ہیں۔ لیکن نتیجہ کے لحاظ سے ہمارے لئے یہ کہنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اس میں واقعی کتنی تلخ حقیقت کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

پطرس کے مضامین میں ظرافت عام ڈگر سے ہٹ کر ہے۔ اس کا آغاز ایک مختصر دیباچے سے ہوتا ہے جو پوری کتاب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اور پطرس کے سارے مضامین سے زیادہ دلفریب ہے۔ اس میں اختصار، حقیقت، طنز سبھی موجود ہے خصوصاً آخری چوٹ تو ایسی بھرپور ہے کہ ہر مترجم قسم کا ادیب یا انشا پرداز تڑپ اٹھتا ہے۔ غور فرمایئے۔ سینکڑوں کتابیں ایسی ترجمہ ہوتی ہیں جو لٹریچر کے سر پہ ایک بوجھ ہیں۔ کاش یہ مترجمین ترجمہ کرنے سے پہلے اہلِ ملک

سے مشورہ کر لیتے۔ غور فرمائیے۔ پطرس نے کتنی زہریلی گولی شکر میں لپیٹ دی ہے۔

صاحبزادے کے لئے تعلیم گاہ، تفریح گاہ کے ہم معنی ہے۔ سب سے زیادہ تفریح ہاسٹل میں پڑھ کر ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس کی کوشش ہے کہ کوئی سال آجائے کہ ہوسٹل میں داخل ہو سکے۔ اس لئے متواتر فیل ہی ہوتے رہنے میں ان کو دلچسپی ہے۔ ادھر ان کے سرپرستوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہاسٹل کوئی بُری جگہ ہے۔ والدین کی نگاہ میں ہاسٹل کو علم اور اخلاق کا اعلےٰ ترین مرکز ثابت کرنے کی کوششیں برابر مضحکہ خیز ہو ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ جس جس طرح فیل ہوا ہے۔ وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں، بالکل ایسے کتنے لڑکے ہمارے ذہن میں ہیں۔ ان سب کا وہ ذو اضعاف اقل مشترک ہے۔ وہ ہمارے مشاہدے کی زبردست مضحکہ خیز حرکت ہے۔

" سویرے جو کل آنکھ میری کھُلی " کے حوالے سے ہماری مڈبھیڑ اسی طالب علم سے ہوتی ہے۔ پڑھنے سے اس کی دلچسپی کا حال دیکھئے۔ پڑھنا، امتحان کے لئے ہے۔ تیاری کے لئے سویرے اٹھنا ہے۔ لالہ جی اس کے پڑوسی مضحک حد تک مستعد اور منہمک ہیں۔ اس کو صبح جگانے کے سین اور اس کے جاگ کر سو جانے کے حالات کس طالب علم نے نہیں دیکھے حقیقت تو یہ ہے کہ ہر طالب علم میں کچھ نہ کچھ ایسی باتیں ضرور ہوتی ہیں۔ پطرس اس میں فرد ہے۔

تمکین کاظمی کے بقول یہ مضمون بڑا نفیس ہے۔ طالب علمی میں سحر خیزی بڑی تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔ پطرس کی شامت جو آتی ہے۔ تو اپنے ایک پڑوسی سے صبح جگا دینے کی خواہش کرتے ہیں۔ اور یہ پڑوسی بھی ایسے مستعد ہوتے ہیں کہ سحر کاذب ہی میں پطرس کے کمرے پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ اور بمباری شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی اس بمباری سے متاثر ہو کر پطرس کے قلم سے بے ساختہ یہ فقرہ نکل جاتا ہے۔

" یہ سوتوں کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں ؟ اور حضرت عیسٰی بھی تو واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں قُم کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا، تو ہو گیا۔ نہیں، تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جایا کرتے تھے۔ توپیں، تھوڑی داغا کرتے تھے "

آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ پطرس صرف خوش مذاقی کے دلدادہ تھے۔ اور طنز و مزاح اور پیروڈی ہی لکھتے تھے۔ بلکہ یہ بھی جان لیجئے کہ پطرس ایک ادیب اور انشاء پرداز بھی تھے۔ اور انشائے لطیف پر بھی انہیں خاص عبور تھا۔ ذیل کا انشائیہ اس منقولہ بالا مضمون کا ٹکڑا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"جب دلِ مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ ہمارا فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب ہو۔ اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُرپیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سریلی اور نازک آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو۔

تم جاگو موہن پیارے

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی طرح تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے۔ چہرہ کسی کی نگاہِ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو۔ آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار ہو جائیں۔ دل آویز صبح کو اور بھی درخشندہ کر دے۔"

پطرس کا یہ مضمون ان مضامین سے ہے جو انہیں زندہ رکھیں گے۔ اس میں خوش مذاقی، انشائے لطیف، طنز اور روانی بلا کی ہے۔ اور ایک طالب علم کی ہاسٹل کی زندگی کا پورا پورا نقشہ موجود ہے۔

پطرس کے یہ دونوں مضامین (پہلا اور دوسرا) ہاسٹل کی زندگی کا آئینہ ہیں۔ ہاسٹل کی زندگی اس سے زیادہ عمدگی اور نفاست سے پیش کی جاسکتی ہے اور نہ تفصیل کہیں مل سکتی ہے۔

محمد حسن فاروقی لکھتے ہیں کہ مضمون "کتے" "میں پہلے ہی جملے نے جادو مارا" علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا۔ سلوتریوں سے دریافت کیا۔ خود سر کھپاتے رہے۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا کیا فائدہ ہے۔ وفادار جانور؟ واہ، کیا وفاداری ہے کہ شام کے سات بجے سے

جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لئے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ لیجئے ۔ ۔ ۔ یہ کتوں کا مشاعرہ گرم ہے ۔ کم بخت بعض تو دو غزلے اور سہ غزلے لکھ کر لائے ہیں ۔ ہنگامہ گرم ہے ۔ پطرس "آرڈر" "آرڈر" پکار رہا ہے ۔ کچھ اثر نہیں ۔ مجبور ہو کر کہتا ہے ۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا ، تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آ کر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کتے 'قومیت کے دلدادہ گئے ۔ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں " کیسے قوم پرست ہیں ۔ پطرس کو دیسی کتوں کی صرف یہی ایک ادا پسند تھی ۔ اور وہ تھی ان کی قوم پرستانہ ذہنیت ۔

"کتے" یہ شاہکار ہے پطرس کا ! کتوں اور پھر سڑک کے کتوں سے کون نالاں نہیں ۔ پھر ان کا بھونکنا کسے نہیں کھلتا ؟ مگر اس بھونکنے اور ایک دوسرے کے سُر ملانے کو مشاعرے سے تشبیہ دینا اور اس نفرت خیز حرکت کو اس نفاست سے بیان کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ۔

" میں ایک میاں ہوں " یہ سو فیصد مزاحیہ مضمون ہے اس میں وہ تمام باتیں آ گئی ہیں جو ایک شادی شدہ نوجوان کو پیش آتی ہیں

حقیقت یہ ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے ان سب دوستوں سے حسد کرنے لگتی ہے ۔ جو زیادہ بے تکلف اور چہیتے ہوں ۔ کیونکہ اسے ایک قسم کی رقابت محسوس ہوتی ہے وہ یہ چاہتی ہے کہ ہر طرح صرف وہی اپنے شوہر کی توجہ کا مرکز بنی رہے ۔ کوئی اور شخص یا اشخاص اس میں حصہ دار نہ ہوں ۔ یہ عورت کی فطرت ہے اس لئے یہ مطالبہ بالکل فطری ہے ۔ اس سے بچنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ عورت پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ دوستوں سے آپ کو محبت ہے یا آپ کے دوست آپ سے محبت کرتے ہیں ۔ چنانچہ اسی چپقلش کو پطرس نے بڑے ہی معصومانہ انداز میں بیان کر دیا ہے چونکہ

ذکر روشن آرا کا اور پھر بیان اپنا ہے۔ اسی لئے
شوخی بھی پیدا ہوگئی ہے۔

میاں، بیوی کے میکے جانے پر خوش ہے۔ کہ ہر قسم کی آزادی ملی لیکن پھر بیوی کے گھر میں نہ ہونے سے گھبرا کر اسے تار دے دیتا ہے۔

گھر خالی ہو اور بے تکلف احباب جمع ہو جائیں تو جوانی میں بالکل یہی کیفیت ہوتی ہے جو تاش کھیلنے میں پطرس کی ہوئی۔ چنانچہ چوربنے ہوئے چلم بدست، کلاہ کاغذی بر سر، روسیاہی کے عالم میں بیوی نے دیکھ لیا اس کے بعد کی کیفیت پطرس ہی سے سنیئے۔

"روح منجمد ہوگئی۔ اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی۔ اور پھر کہنے لگی...... لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی! اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بے ہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی!"

تمکین کاظمی کے بقول یہ مضمون بڑے نفیس انداز میں لکھا گیا ہے۔ یہ کلاہ کاغذی جس کے سر پہ رکھ دیجئے۔ مغلول بن جاتا ہے۔ بظاہر ایک سیدھا سادا واقعہ بیان کر دینا کوئی بات نہیں۔ مگر اس عمدگی، اس تسلسل، اس ہم آہنگی، اس روانی، اس ڈھٹائی، اس صفائی، اس شستگی، اس خوبصورتی، اس نفاست، اس ندرت اور اس ہمت سے لکھنا محال ہے۔ اور یہ کمال پطرس کے ہاں بدرجہ اتم موجود تھا۔

"اردو کی آخری کتاب" ایک خوبصورت پیروڈی ہے۔ پطرس کی اس تحریف کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اس کے پیش نظر کوئی خاص سنجیدہ مقصد نہیں۔ اور نہ اس میں طنز کی جراءت سے قوت اور استحکام حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی ساری کامیابی اس آسودگی کے احساس میں ہے، جو ہلکے پھلکے مزاحیہ نکتوں کی مدد سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جو ناظر کی جذباتی وارفتگی میں بھی ایک بچت (Economy) پیدا کر دیتا ہے چنانچہ تصویر کا دوسرا رخ دکھانے، کرداروں کا مذاق اڑانے اور بات کی بلند سطح کو حقائق کی پست سطح سے ملانے میں پطرس نے ایک

ایسا ہمدردانہ اندازِ نظر اختیار کیا ہے کہ ناظر کے دل میں اصل سے نفرت کا جذبہ بیدار نہیں ہوتا بلکہ وہ اصل سے محظوظ ہونے لگتا ہے۔

پطرس کی دوسری تحریف "لاہور کا جغرافیہ" ہے۔ پطرس کی اس تحریف کے دو پہلو قابل ذکر ہیں۔ پہلا: یہ تحریف لفظی نہیں بلکہ ایک خاص اندازِ تحریر کی نقل پیش کرتی ہے۔ اس تحریف میں پطرس نے طنز کا استعمال بھی کیا ہے۔ تاہم ان کا فطری ہمدردانہ نقطۂ نظر اور خوش مزاجی کا رجحان پورے مضمون پر غالب ہے۔

ان دو تحریفوں میں پطرس کے ہاں تحریف کے دو رُخ ملتے ہیں۔ ان کی ایک تحریف نے تو آسودگی کے احساس کو جنم دیا ہے۔ اور دوسری نے بعض ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو ہدفِ طنز بنایا ہے۔ ہیئت کے لحاظ سے بھی ان دونوں تحریفوں میں نمایاں فرق ہے ایک تحریف قطعاً لفظی ہے اور اس میں محض الفاظ کی معمولی تبدیلی سے اصل کا حلیہ اس طور پر بگاڑ دیا جاتا ہے۔ کہ اصل سے ناظر کا جذباتی تعلق بڑی حد تک ختم ہو جاتا ہے۔ اور ہنسی کو تحریک مل جاتی ہے: دوسری تحریف لفظی نہیں۔ بلکہ صرف ایک مخصوص طریق کار اور ایک اندازِ فکر کی نقل تک محدود ہے۔ ان دونوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ پہلی تحریف براہ راست اصل سے متعلق ہے لیکن دوسری نے اصل کا سہارا لے کر ایک مختلف میدان میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ پہلی تحریف" اردو کی پہلی کتاب" پر پطرس کی مشہور پیروڈی ہے۔ دوسری میں انہوں نے جغرافیہ لکھنے کا تو ایک خاص حد تک، لیکن بعض سماجی بداعتدالیوں کا ایک بڑی حد تک مذاق اُڑایا ہے۔ تاہم ان دونوں تحریفوں میں تحریف کے بعض بنیادی عناصر کو اس درجہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ہم ان کو اردو زبان میں بہترین تحریفات میں شمار کرنے پر مجبور ہیں (۱)

مرید پور کا پیر' ایک جاہل اور سیاسیات سے ناواقف شخص' لیڈر بننے کے لئے

(۱) پطرس کی تحریف نگاری' ڈاکٹر وزیر آغا نقوش پطرس نمبر صفحہ ۵۸۔

کس طرح کوشاں رہتا ہے؟ اور لیڈری کی تیاری کس طرح کرتا ہے۔ یہ مضمون اس کی ساری تفصیل بیان کرتا ہے۔

سینما کا عشق، اپنی روانی، تسلسل اور زور کے لحاظ سے بڑا ہی تیکھا اور مزے دار مضمون ہے۔ اس میں انسانی جھنجلاہٹ کے سارے پہلو نمایاں کئے گئے ہیں۔ اور سینما دیکھنے والوں کی حرکات پر بڑا ہی لطیف طنز کیا گیا ہے۔ یہ طنز جتنا گہرا ہے اتنا ہی لطیف اور اسی قدر واقعاتی ہے جسے لوگ صرف واقعات کا اظہار سمجھ کر بھی پڑھ لیتے ہیں اور صاحبانِ بصیرت اس سے عبرت بھی حاصل کرتے ہیں۔ اور اہلِ دل اس کے طنز سے لطف اٹھاتے ہیں۔

" مرحوم کی یاد میں " یہ کسی کا مرثیہ نہیں۔ اور نہ اس میں کسی واقعی مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ بھی پطرس کے دوست مرزا کی ایک سادہ لوحی کا نقش جمیل ہے اس مضمون میں کوئی لفظ ایسا نہیں، جو مضحکہ خیز نہ ہو۔

اس مضمون میں پطرس نے سماجیات، ثقافت، تہذیب، تمدن، روز مرہ زندگی اور فطرتِ انسانی کے بڑے بڑے نکتے حل کر دیئے ہیں۔ تمہید میں لکھا ہے " جب دوستی پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں "! دیکھئے۔ نفسیات کا کتنا پیچیدہ مسئلہ اس نکتے نے حل کر دیا ہے۔

" میبل اور میں " یہ ایک افسانہ اور طنز یہ افسانہ ہے۔ مرد عام طور پر نیک اور سادہ لوح واقع ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ عورت کو نیک اور معصوم سمجھتا ہے۔ اور پھر اگر تعلیم یافتہ مرد ہو اور عورت یورپ کی ہو تو اس کی نیک نیتی اور سادہ لوحی اور بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی معاملہ میبل سے ہوا ہے۔ عورت ہمیشہ مرد کو دھوکہ دیتی ہے اور شرماتی نہیں۔ مگر مرد کسی عورت کو کبھی دھوکہ دیتا ہے تو مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہی اس افسانے کا ماحصل ہے۔

اثر لکھنوی کے بقول " مضامین پطرس " بظاہر ہولا خیط پن کے شاہکار ہیں۔ مگر

مصنف نے فی الحقیقت سوسائٹی اور تمدن کی دکھتی رگوں کو چھوا ہے اور خام کاریوں اور سفیہانہ رواسم و توہمات کا پردہ فاش کیا ہے۔ پطرس نے اپنا مطلب زیادہ تر مزاح میں طنز کی چُٹ دے کر نکالا ہے۔ بخلاف دیگر ظرافت نگاروں کے جو تمسخر کو آلۂ کار بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان مضامین میں جھنجھلاہٹ کی بجائے گدگدانے کی ادا نکلتی ہے اور اسی کے ساتھ غور و تعمق کی دعوت دیتی ہے۔

پطرس بحیثیت ایک مترجم

۱۹۲۴ء میں پنجاب ٹیکسٹ بورڈ کمیٹی نے دس ہزار روپے کی رقم مخصوص کر کے یہ اسکیم منظور کی کہ انگریزی کی بعض معلوماتی کتابیں، جن سے بچوں کو خاص دلچسپی ہو مروجہ دیسی زبانوں میں ترجمہ کرائی جائیں تاکہ اردو ادب کی حوصلہ افزائی ہو۔ اس کے بعد کمیٹی ہر سال اس مقصد کے لیے روپیہ منظور کرتی رہی۔ ۳۲-۱۹۳۱ء میں بخاری کو پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے سیکرٹری کا عہدہ پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ اپنے فرائض منصبی کے علاوہ وہ چار پانچ سال تک اس خدمت کو بھی باحسن الوجوہ انجام دیتے رہے۔ سیکرٹری کی حیثیت سے انہوں نے بھرپور اور جامع رپورٹیں مرتب کیں۔ اور اس عرصہ میں انہوں نے دو تین ضخیم انگریزی کتابیں خود بھی ترجمہ کیں۔ ان میں ایک تو برٹرنڈ رسل کی تصنیف تھی جس کا ترجمہ " تعلیم خصوصاً اوائلِ طفلی میں" کے نام سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ ۲۰۴ صفحات کی کتاب ہے دوسری کتاب ہنڈرک فان لون کی سٹوری آف مین کائنڈ (Story of Mankind) تھی جس کا ترجمہ " نوعِ انسانی کی کہانی" کے نام سے ۱۹۳۹ء میں طبع ہوا یہ ۵۲۰ صفحات کی کتاب ہے۔ اور اپنے موضوع کے لحاظ بے حد اہم ہے۔

تیسری کتاب ایف۔ ایل۔ برین کی تھی۔ انڈین سول سروس کے اس انگریز حاکم نے دیہات سدھار، سقراط ہندوستان کے گاؤں میں —— ہندوستان کے گاؤں کی اصلاح وغیرہ کئی مفید کتابیں انگریزی میں لکھی تھیں۔ جو بے حد مقبول ہوئی تھیں۔ انکی ایک کتاب کا ترجمہ بخاری نے غلام عباس کی مدد سے کیا جو " دیہات میں بوائے سکاؤٹ کا کام" کے نام سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ دو سو صفحات کی اس کتاب میں دیہاتی سکاؤٹوں کے

ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ وہ اپنے گھروں اور اپنے گاؤں کی بہتری کے لئے کیا کچھ کر سکتے ہیں (۱) بخاری انگریزی کی روح میں ڈوب کر اردو کی بلند سطح سے اُبھرتے اور بے تکلفی سے ترجمہ کرتے تھے کہ اصل کا دھوکہ ہونے لگتا تھا اور ترجمہ معلوم نہیں ہوتا ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں ہم درج ذیل مثالیں پیش کرتے ہیں۔

آر ایل۔ اسٹیونس (R.L. Stevens) کے شہرہ آفاق مضمون مارخائیم کا ترجمہ کرتے وقت زندگی کے بارے میں مارخائیم کے تاثرات' پطرس کی زبانی سُنیئے۔

"غور سے دیکھو۔ تو زندگی کا ہر لمحہ ایک چٹان ہے۔ میل بھر اونچی چٹان' اتنی اونچی کہ وہاں سے چھوٹ کر گریں تو زمین سے ٹکرا کر انسانیت کا تمام حلیہ مسخ ہو جائے۔ اسی لئے مزے مزے کی باتیں کرتے رہنا ہی بہتر ہے"

پطرس' منظر کشی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ کسی مقام پر بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے۔ کہ وہ ترجمہ کر رہے ہیں۔ ان کے تراجم طبع زاد دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو' درج ذیل اقتباسات میں وہ قاری کے ذہن پر مارخائیم کی ذہنی کش مکش کا کتنا بھرپور تاثر چھوڑتے ہیں۔

" مارخائیم چونکا اور ہیبت خوردہ نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ شمع دکان کے تختے پر جل رہی تھی اور شعلہ ہوا سے ہلکے ہلکے جھوم رہا تھا۔ شعلے کی اس خفیف حرکت سے ایک بے آواز ہنگامہ بپا تھا۔ اور کمرہ سمندر کی مانند لہریں مارتا تھا۔ لمبے لمبے سائے اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ تاریکی کے مہیب دھبے پھیلتے تھے۔ اور سکڑ جاتے تھے۔ جیسے ہانپ رہے ہوں۔ تصویروں کے چہرے اور چینی کے بت پانی کے عکس کی مانند لرزاں اور متغیّر تھے۔ اندر کا دروازہ ذرا کھلا تھا اور اس میں سے روشنی کی ایک لکیر سایوں کی اس دنیا میں یوں جھانک رہی تھی۔ جیسے کوئی انگلی اشارہ کر رہی ہو" مارخائیم کی کہانی بڑی پر اسرار فضا میں بیان کی گئی ہے۔ اس کیفیت کا اظہار پطرس کے الفاظ میں سُنیئے۔

(۱) ہر لمحہ جس کا حسن تماشائے گوش تھا" محمد عبداللہ قریشی نقوش پطرس نمبر صفحہ ۳۰

مارخاتیم کو کچھ جنون سا ہو گیا کہ پراسرار ہستیاں مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، بلکہ اوپر کے کمروں میں چلتی پھرتی معلوم ہو رہی ہیں۔ بڑی مشکل سے سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا تو یہ معلوم ہوا۔ جیسے اوپر کوئی دبے پاؤں پیچھے کو بھاگ گیا ہو اور کوئی ہلکے ہلکے اس کے پیچھے چڑھ رہا ہو۔ سوچا اگر میں بہرا ہوتا، تو اس وقت روح کو کتنا اطمینان ہوتا لیکن پھر سوچا۔ یہ بیلا خواص ہی تو ہیں جو اس وقت میری زندگی کی حفاظت کے لئے پہرہ دے رہے ہیں"

مارخاتیم، ہمیں گہری سوچ میں غلطاں دکھائی دیتا ہے۔ پھر وہ یک لخت چونک کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور دفعتہً "برف کی سی خنکی، خون کا ابلتا ہوا فوارہ، آگ کا ایک شعلہ اس کے جسم میں دوڑ جاتا ہے۔ اس کے پاؤں وہیں کے وہیں جم جاتے ہیں اور جسم تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔ اپنی ذہنی کیفیات، مارخاتیم کے اپنے الفاظ میں سنیئے۔ جسے پطرس نے بڑی فنی چابکدستی سے بیان کیا ہے۔ "میری زندگی خود میرا ہی بگڑا ہوا نقشہ اور خود مجھی پر ایک تہمت ہے۔ میں نے عمر بھر اپنی فطرت کو جھٹلایا ہے۔ ہر انسان کا یہی حال ہے۔ ہر انسان اس ملمع سے بدرجہا بہتر ہے جو وہ اپنے اوپر چڑھاتا رہتا ہے اور جس کے اندر اس کا دم گھٹا جاتا ہے" ہر انسان کشاں کشاں جدھر لے جائے، ادھر ہی کھنچا چلا جاتا ہے، جیسے رہزن کسی کو پکڑ کر اس پر کمبل ڈال دیتے ہیں اگر ان میں سے کسی کو اپنے اوپر اختیار ہو، اگر کبھی وہ اپنے اصل روپ میں دکھائی دے جائیں تو تم انہیں اس سے کہیں مختلف پاؤ گے اور ان کے چہروں پر نامور بہادروں اور خدا رسیدہ بزرگوں کا سا نور چمکتا نظر آئے گا۔ میں بہت سوں سے بُرا ہوں۔ مجھ پر جھوٹ کی بہت موٹی تہ جمی ہے اور خود مجھے اور میرے خدا کو معلوم ہے لیکن اگر مجھے مہلت ہو تو میں اپنی اصل حقیقت آشکار کر سکتا ہوں"

پطرس، ترجمہ نہیں کرتے۔ تخلیق کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں، ڈھلی ڈھلائی شاعری کا ایک تابندہ نمونہ ہیں۔ صید و صیاد کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"بیگم صاحبہ! آپ کی نیلی آنکھوں میں جب غصہ چمک آتا ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا

ہے کہ گویا آسمان کی نیلگوں گہرائیوں کے ایک تلاطم میں کہیں سورج نظر آیا ہو۔ پھر اس پر بادل گھر گھر آتے جاتے ہیں۔ پھر کس ناز سے بجلیاں چمکتی ہیں۔ پھر شاید چند بوندیں بھی ٹپک پڑتی ہیں اور پھر سورج اپنا رخِ تاباں بے نقاب کر دیتا ہے جس نے اس روح افزا نظارے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں تو وہ حسن کی کس طرح قدر کر سکتا ہے۔"

"نثری شاعری کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

"اور پھر کیا ہوا؟"

"اور پھر میرے شاعر! ہم ستاروں ہی کی باتیں کریں گے"

شاعر نے پوچھا "ان دو نیلے ستاروں کی جو اس وقت مجھ پر چمک رہے ہیں؟"

"خاتون نے نوجوان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کہا "یونہی سہی"

"عشق کی خودکشی" میں پطرس کے قلم کی جولانیاں ملاحظہ ہوں:

"میرا دل اس وقت جذبات سے بالکل عاری ہے۔ میرے دل کی اس وقت وہی حالت ہے جو کسی محفل کی صبح کے وقت ہوتی ہے۔ جب سحر کی پھیکی روشنی اور تھکان کا خواب آلود سکون مشاغلِ شبانہ کی ہوسناکیوں اور عشرتوں کو بے رنگ اور بھیانک کر دیتا ہے۔ میرا دل ایک کھنڈر ہے۔ جس میں زندگی نہیں، آثار نہیں۔ جہاں حالِ دل بیدار نہیں، ماضی خفتہ ہے۔ جہاں نہ نالہ ہے نہ نغمہ۔ فقط ایک ویران سی گونج ہے جس کے میرے نزدیک کوئی معنی نہیں۔ جو نوائے زندگی اور غلغلہ حیات نہیں ہے۔ ایک خندہ بے مسرت، ایک فریادِ بے درد ہے۔"

اب پطرس کی ایک اور لائق داد تحریر ملاحظہ ہو۔ جس سے عورت کی نفسیات طشت از بام ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

"عورت اگر چاہے تو مرد کی زندگی کو تباہ کر سکتی ہے۔ فطرت نے دلوں کے توڑنے کے جس قدر بھی ڈھنگ ہیں وہ تمام عورت کو سکھا رکھے ہیں۔ قدرت نے مردوں کے دل

محض اس لیئے بنائے ہیں کہ عورتیں انہیں بے پروائی سے توڑ ڈالا کریں۔ ہماری آنکھیں اسلیئے ہیں کہ یا ہم ان کو دیکھیں یا ہم ان کے لیئے روئیں۔ عورت کو خراج نگاہ چاہیئے یا خراج اشک۔ اسی دولت سے وہ کشور دل پر حکمرانی کرتی ہے۔ ان کا عہد ایک دور ظلم ہے۔ اور ایک عہد ستم۔ جہاں بغاوت کے بغیر چارہ نہیں، مرد عورت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس خیال سے کہ اس کی خواہشات کی تکمیل بطریق آسن ہو۔ وہ اس کی مرضی ڈھونڈتے رہتے ہیں کہ اسے پورا کریں۔ عورت دیوانگی کا سحر کرنا جانتی ہے۔ راحت کی نیند سُلانا نہیں جانتی۔ اندھا کر دیتی ہے۔ اپنے قریب آنے کا راستہ نہیں بتاتی۔

کائنات ایک مجسم بے قاعدگی ہے عورت کی محبت ایک افسانہ ہے۔ روح جسم کا دوسرا نام ہے۔ جذبات کی کوئی حقیقت نہیں۔ ایک ہستی کئی ہستیوں سے مرکب ہوتی ہے۔ آج تم کچھ ہو کل خدا جانے کیا ہو گے ؟"

پطرس کے ترجمے کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے پڑھنے والے کا کام آسان کر دیا ہے یہاں تک کہ اسے تخیلی گرفت میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ الفاظ کی پُر وقار موسیقی، فقروں کا اتار چڑھاؤ، مکالموں کی ڈرامائی حرکت سے نہ صرف کرداروں میں جان آگئی ہے بلکہ تھیبس اور سکندریہ کی دھندلی اور دور و دراز مقامات رات کے کسی دلفریب خواب کا جز معلوم ہونے لگتی ہے۔ اسلوب یکساں، ہموار اور ہم آہنگ ہے اور ترجمہ کے بعض حصوں میں نثر کے ڈانڈے نظم بلکہ نغمہ سے جا ملتے ہیں۔

پطرس نے انگریزی ڈراموں اور کہانیوں کو ہی اردو کے قالب میں منتقل نہیں کیا بلکہ متعدد فنی مضامین کا بڑا حسین ترجمہ کیا ہے۔ پروفیسر ہنری برگسان کا فلسفۂ خندہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اس میں برگسان نے ہنسی کے جو تین بنیادی اصول بیان کیئے انہیں پطرس یوں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ کوئی سامان تضحیک انسانی دائرہ سے باہر نہیں پایا جاتا۔

۲۔ اکثر دفعہ ہنسی کے وقت جذبات مفقود ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اگویا کوئی مضحک چیز اپنا اثر پیدا ہی نہیں کرسکتی۔ جب تک روح انسانی مکمل سکون و قرار کی حالت میں نہ ہو۔

۳۔ ہنسی کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ ایک انسان کا دماغ اور انسانوں کے دماغ سے دور افتادہ نہ ہو۔ اور یہ تیسرا نکتہ ہے جو توجہ کا طالب ہے۔ اگر آپ اپنے آپ کو بالکل تنہا اور بے رفیق محسوس کریں تو آپ مضحک اشیا سے متاثر نہیں ہوسکتے۔ ہنسی کے لئے ہمیشہ ایک گونج ایک صدائے بازگشت یعنی شرکت در فاقت کا ہونا ضروری ہے آپ ہنسی کی آواز کو غور سے سنیئے۔ یہ صاف و صریح، بینی تُلی اور شستہ آواز نہیں، خود اس آواز کی نوعیت میں گونجتے رہنے کی خواہش مضمر ہوتی ہے۔ کہ ایک دھماکے کی طرح یکایک زور سے پھٹ کر شروع ہوتی ہے اور تسلسل لرزاں کے ساتھ جاری رہتی ہے گویا پہاڑوں میں بادل گرج رہے ہوں۔

مندرجہ بالا باتوں سے جو نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ سامانِ تضحیک انسانی دائرے سے باہر نہیں پایا جاتا۔

۲۔ ہنستے وقت جذبات معطل ہوتے ہیں۔

۳۔ ہنسی کے لئے ایک سے زیادہ (حقیقی یا خیالی) ہنسنے والوں کا ہونا ضروری ہے یعنی ہنسی اس وقت پیدا ہوسکتی ہے جب انسانوں کی ایک جماعت اپنی توجہ ایک فرد کی طرف اس طرح منعطف کرتی ہے کہ اپنے جذبات کو معطل کردیتی ہے اور صرف اپنے عقل و فہم سے کام لیتی ہے۔ ہنسی سوسائٹی کی ایک انگشت نمائی ہے جو وقتاً فوقتاً ہماری اصلاح کرتی رہتی ہے۔ اس کا تعلق محض لطافت قلبی سے نہیں۔

پطرس نے برگساں کے فلسفہ میں ڈوب کر انگریزی مثالوں کو اپنی معاشرت کے حسب حال بنانے میں مجتہدانہ قدرت سے کام لیا ہے اور یہی ان کے فن کا کمال ہے۔

پطرس کے تعلیمی نظریات

پطرس ایک بلند پایہ مزاح نگار اور مترجم ہی نہ تھے ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ نظام تعلیم کو بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے پطرس نے بڑا تحقیقی کام کیا ہے۔ اپنے مضمون "پاکستان میں تعلیم کا مستقبل" میں لکھتے ہیں کہ موجودہ نظام کے نقائص کی فہرست تیار کرنا دشوار ہے۔ البتہ تین باتوں پر اتفاق پایا جاتا ہے۔

اوّل تو انگریزی زبان کی حیثیت ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں انگریزی کو ذریعۂ تعلیم اور لازمی مضمون کی حیثیت سے جو اہمیت حاصل ہے وہ نہ صرف قومی بلکہ خالص علمی نقطۂ نظر سے بھی بے حد قابل اعتراض ہے۔ غیر ملکی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم قرار دے دینا نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ یہ طالب علم کی ذہنی نشوونما کو محدود بھی کر دیتا ہے۔

دوسرا نقص ہے ہماری تعلیم کی "ناقومیت"! ہمیں اس ناقومیت کے مختلف مظاہر دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً ایک طرف تو یہ کہ دیسی ملکی قومی زبانیں کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہیں۔ اور دوسری طرف یہ کہ ہماری موجودہ تعلیم نہ صرف مادی اعتبار سے فضول و بے سود ہے بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ناکارہ اور لایعنی ہے۔

تیسری خصوصیت ہے۔ ہمارے نظام تعلیم کی محدودیت، پڑھے لکھے لڑکوں اور مردوں کی تعداد پندرہ فیصد سے بھی کم ہے اور اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو محض دستخط کرنا جانتے ہوں۔

آگے چل کر پطرس اردو زبان کی اہمیت واضح کرتے ہیں اور پھر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ

اُردو کی حقیقی ترقی کا کام واقعی محنت طلب ہے۔ یونیورسٹی میں تمام مضامین کے لئے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا انحصار اس امر پر ہوگا۔ کہ اردو میں ان مضامین پر کس قدر جلد کتابیں تیار کی جا سکتی ہیں اور کتابوں سے مراد محض نصاب کی کتابیں ہی نہیں بلکہ اعلیٰ و تحقیقی مواد جو طالب علم اور استادوں کے ذہنی آفاق کے لئے وسعت اور پس منظر کے لئے پختگی کا سامان میسّر کرے۔

پطرس لکھتے ہیں کہ ہمیں زمانۂ حال کو تراجم بنانے کی ضرورت ہے تاکہ انگریزی کی مراجعت اِلی الوطن سے پہلے ہم اس سے مغربی سائنس اور کلچر کے تمام راز ہائے سربستہ اخذ کر چکے ہوں۔ پطرس اس امر پر متفکر ہیں کہ اگر تعلیم کی یہی رفتار جاری رہی تو ملک بھر سے ناخواندگی اور جہالت دور کرنے کے لئے کچھ نہیں تو ڈیڑھ سو سال درکار ہوں گے۔ ہاں۔ اگر ہم فوق الطبعیاتی کوشش کا مظاہرہ کریں اور اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لے آئیں یعنی یہ کہ ہر پڑھے لکھے آدمی کو استاد بنا دیں اور ہر گلی کوچے کو اسکول بنا دیں تو ڈیڑھ سو سال کا کام ربع صدی میں طے پا سکتا ہے افسوس، اس محاذ پر کوئی بات قابل ذکر نہیں۔ برطانوی راج پر سب سے بڑا داغ یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں ہمارے فائدے کے لئے نہیں بلکہ اپنے فائدے کے لئے پڑھایا اور یہ کتنے ستم کا مقام ہے کہ ہمارے اربابِ اختیار بھی برطانوی روایت کو برقرار رکھنے پر مصر ہیں اور نہایت احتیاط سے پروان چڑھانے میں مصروف ہیں۔

پطرس اور قدیم یونانی حکماء

پطرس، عالمی ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ فلسفہ کی تاریخ کا بھی انہوں نے عمیق مطالعہ کر رکھا تھا۔ یونانی فلسفیوں کے نظریات کا انہوں نے تجزیاتی جائزہ لیا ہے۔

اپنے مضمون "قدیم یونانی حکما" میں پطرس ان مفکروں کے خیالات کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق مصنفین، فلسفے کی تاریخ کو عام طور پر حکماء کے اس گروہ سے شروع کرتے ہیں جو چھٹی صدی قبل مسیح میں ایشیائے کوچک کے کنارے یونانیوں کے بسائے ہوئے شہر میلاطیس میں آباد تھا۔ یہ حکماء مسئلہ تغیر کے متعلق بہت کچھ سوچتے رہتے تھے وہ دیکھتے تھے کہ یہ دنیا عالمِ کون و فساد ہے۔ اشیاء بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ تعمیر کے ساتھ تخریب اور تخریب کے ساتھ تعمیر ہمیشہ کے لئے وابستہ ہے۔ مگر باوجود اس کے کوئی چیز بھی عدم مطلق سے وجود میں نہیں آتی اور نہ وجود سے عدم مطلق ہی میں چلی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی چیز بالکل از سرِ نو شروع نہیں ہوتی اور نہ کبھی دائمی اختتام پر ہی پہنچتی ہے۔ ہر ایک چیز تغیر کے لامتناہی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مگر آخر یہ تغیر کس چیز کا ہے؟ وہ ایک چیز کیا ہے؟ جو مختلف ہستیوں میں آ کر مختلف اشیاء اور اجسام بن جاتی ہے؟ وہ کونسا ایک مادۂ بنیادی ہے جو متغیر ہو کر مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے؟ یہ ایک معمہ تھا جس کو حل کرنے پر قدیم یونانی حکماء نے اپنی کمر ہمت باندھی۔

پطرس نے آگے چل کر تھیلس، اینکسی مینڈر اور ہرقلاطیس کے تصورِ کائنات سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ پھر سقراط اور ارسطو کے افکار کا احاطہ کیا ہے۔ اس ساری بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارسطو نے اس بارے میں اپنی توجہ کو زیادہ تر حیوانات اور نباتات تک

ہی محدود رکھا۔ اسی سے اس نے افلاک کی ابدی گردش کا سبب دریافت کرنے کی کوشش کی۔ غیر ذی روح اشیاء کی حرکت کسی اور متحرک شے کے تصادم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مگر ذی روح اجسام کی حرکت اس طرح کی نہیں۔ افلاطون نے ہمیشہ متحرک رہنے والی روح کو تمام حرکات کا منبع قرار دیا تھا، مگر ارسطو ذی روح اشیاء کی حرکت کو خود زاد سمجھتا تھا۔ ذی روح اشیا کی حرکت کی علت ہمیشہ علاوہ ازیں حرکت ہوتی ہے۔ یہ علت تصادم سے تو نہیں۔ مگر ان اجسام کی خواہشات گو اکسانے سے ان کی حرکت کا سبب ہوتی ہے، اور اس لئے ضروری نہیں کہ وہ خود متحرک ہو کیونکہ خواہش ایسی چیز بھی ہو سکتی ہے جس میں خود کوئی خواہش نہ ہو یا جو اس خواہش سے مطلق بے خبر ہو۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ بالآخر تمام اشیا کی حرکت کا منبع ایک ایسا غیر متحرک محرک ہے جو ذی روح اجسام کی خواہشات کو حرکت دے کر خود ان کی حرکت کا باعث ہوتا ہے۔ کائنات کا یہ غیر متحرک محرک خدا ہے۔ وہ نفس خدا دنیا کو اس طرح گردش میں رکھتا ہے جس طرح کوئی محبوب اپنے عاشق کو۔ مگر جس طرح تمام اشیا اس کی طرف کھنچی کر رہ جاتی ہیں وہ کسی کی طرف کھینچ کر نہیں آتا۔ ایسی اکمل اعلیٰ بے نیاز ہستی کے ساتھ اگر کوئی شغل منسوب کیا جا سکتا ہے تو وہ شغل علم ہے۔ اور ایسی چیز جس کا علم اس کی شان کے شایان ہو، اسکی اپنی ذات ہے۔ ارسطو کے خیال میں خدا دنیا کا بنانے والا نہیں۔ دنیا ازلی وابدی ہے۔ نہ ہی وہ دنیا کی روح ہے۔ وہ اکمل ذات ہے جس کے ساتھ اپنے آپ کی مطابقت دینے کے لئے تمام دنیا کوشاں ہے۔

افلاطون اور ارسطو کے فلسفۂ اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے پطرس لکھتے ہیں کہ افلاطون کے نزدیک ہر ایک چیز تمام افراد جمہور کی ملکیت مشترکہ ہے اور سلطنت کے "سرپرست" (خواہ وہ مرد ہوں یا عورت) کسی چیز کو بھی اپنا نہیں کہہ سکتے۔ حتیٰ کہ وہ کسی شخص کو اپنا خاندان، اپنی بیوی، اپنا بچہ، اپنی ماں، اپنا باپ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مگر ارسطو کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ وہ "ہر چہ از یار ماست از ماست" کے اصول کو ممکن العمل نہ سمجھتا تھا۔ وہ قریبی

دست ایک دوسرے کی چیز کو اپنی چیز سمجھ کر استعمال کر سکتے ہیں مگر جہاں ہر ایک شخص اپنی چیز پر اپنا حق دوسروں کے برابر سمجھتا ہو۔ وہاں بدنظمی اور بے ترتیبی کا پیدا ہونا لازمی امر ہے، اور نہ ہی اس طرح سب کو حقوق مساوی دینے سے اتحاد و موافقت کے بڑھنے کی کوئی امید ہوسکتی ہے۔ اس لئے ارسطو ایک شخص کے دوسرے شخص سے دولت مند ہونے کو اپنے آئین کے ماتحت ممکن و جائز سمجھتا تھا۔ روپیہ مالداروں کو اس حد تک حق مزید دلاتا ہے کہ اس کی بدولت وہ بھوکے ننگوں کی دستبرد سے بچے رہتے ہیں مگر ان کو بالکل ہی لاچار اور بے بس نہیں بنا سکتے۔

پطرس تنقیدی مضامین کے تناظر میں

پطرس کے تنقیدی اور فنی مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ خواہ وہ دیباچوں کی شکل میں ہوں۔ خواہ مضامین کی صورت میں۔ 'نتیجہ خیز بات کرنے میں' فن کی باریکیوں اور اس کی تہہ تک پہنچنے میں' جیسی نظر ان کی تھی۔ کم کسی کو نصیب ہوئی ہے۔

نیاز مندانِ لاہور کی جانب سے پطرس یو پی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں چند "معروضات" پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان میں اردو کے تین مراکز ہیں۔ یوپی' حیدرآباد (دکن) اور لاہور۔ لیکن اہل بنیش بھی یہ بات گا ہے گا ہے بھول جاتے ہیں کہ یوپی میں یہ زبان خود رو ہے۔ حیدرآباد میں یہ زبان ایک والئ ملک کے سایۂ عاطفت میں پلی ہے اور صرف پنجاب ہی ایک علاقہ ہے۔ جہاں اس کی نشوونما محض خونِ عشّاق کی مرہونِ منت ہے۔ جس جگہ یہ زبان خود رو ہے وہاں خود بین بھی ہے۔ جہاں اتالیق شاہی سے تعلیم پا رہی ہے۔ وہاں عوام سے کچھ کھینچ کر رہتی ہے لیکن پنجاب میں اس زبان کی حالت ایک ہونہار' تنومند نوجوان کی ہے جس کا خون گرم ہے۔ اور جس کے اعضا میں لچک ہے، جو چھلانگیں مارتا جاتا ہے۔ اور اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کا ہر قدم پگڈنڈی پر پڑتا ہے یا نہیں۔ اسے سمت کا اتنا ہی شعور ہے جتنا کسی اور قدرتی نمو کو ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ سوائے گرمئ حیات کے اور کسی بیرونی قوّت کا احساس نہیں۔ لیکن قوّت نامیہ خود ہی راستہ ڈھونڈتی ہے جو بخطِ مستقیم کھلی روشنی اور تازہ ہوا کی طرف جاتا ہے۔

پطرس آگے چل کر لکھتے ہیں کہ یہ کہنا کہ پنجاب نے یوپی سے کسبِ فیض نہیں کیا یا یہ کہ پنجاب' یوپی کی روایات سے یک قلم مقاطعہ پر تلا ہوا ہے۔ کذب اور مبالغہ ہے۔ مگر یہ بھی ایک ناقابلِ

تردید حقیقت ہے کہ یوپی کے چشمے اب خشک ہو چکے ہیں۔ اس لئے پیاس بجھانے کیلئے اب وہاں جانا بے سود ہے۔ یوپی میں "ادب" بقول پطرس، اردو کا ایک سسکتا ہوا سانپ ہے جو کبھی کبھی ایک نحیف سی پھنکار مارتا ہے اور بس۔ اب یوپی صرف اعتراض کر سکتا ہے رہنمائی نہیں کر سکتا۔

یوپی والوں کا صرف زبان کے اعتراضات پر زور ہے۔ اس محاورے پر، اس لفظ پر، اس حرف پر، اس نقطے پر نظریں گڑی ہوئی ہیں۔ نگاہ میں وسعت نہیں اور طبیعت میں یہ بلندی نہیں کہ کسی اور چیز کو جانچ سکیں یا اصل مدعا کے متعلق چھوٹے منہ سے دو لفظ بھی کہنے کی توفیق پیدا کر سکیں۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے کاروان اردو کئی منزلیں طے کر گیا۔ لیکن حضرات یوپی ہنوز "تک" اور "تلک" کے پھیر میں ہیں۔ وہ زبان اردو کو اشوک کا ایک کتبہ سمجھتے ہیں۔ جو دہلی یا لکھنؤ میں نصب ہے۔ اور جس کا تتبع ان پر بھی ضروری ہے۔ جو جمادات کی منزل سے آگے نکل چکے ہوں آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ پنجاب اس زبان کو اپنے خون سے سینچنے کو تیار ہے۔ اس لئے ظلم ہے اگر اس سے بار بار یہی کہا جائے کہ تمہارا خون رذیل ہے۔ اور اس کے مقابلے میں بار بار ان مردہ ہڈیوں کو سراہا جائے، جو مدت ہوئی بے مغز ہو چکیں۔

"غنچۂ تبسم" کے دیباچوں پر ایک نظر کے عنوان سے پطرس لکھتے ہیں۔ کہ کچھ عرصے سے دیباچوں کا مرض برصغیر میں بڑھ رہا ہے۔ "ملا کتاب لکھتا ہے، تو حاجی اس پر دیباچہ لکھتا ہے۔ حاجی قلم اٹھاتا ہے تو ملا اس کا تعارف کراتا ہے۔ مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ من ترا ملا بگویم، تو مرا حاجی بگو۔ یہاں تک تو یہ حرکت گوارا ہے کہ ملک میں ابھی تک جہالت کی کثرت ہے اور ہمارے اہل قلم اتنی دقیق باتیں لکھتے ہیں کہ "جب تک ایک مصنف کے نکات اسی پائے کا دوسرا مصنف بعد از اشاعت لوگوں کے سامنے حل کر کے نہ رکھ دے۔ بنی نوع انسان کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے فیض سے محروم رہتی ہے۔"

پطرس اس بات پر سخت دلفگار ہیں کہ ہمارے انشا پرداز جب تنقید کرنے بیٹھتے ہیں تو

ایسی اوٹ پٹانگ باتیں اس وثوق کے ساتھ کرتے ہیں کہ ان کی نخوت کے بلبلے میں چھید کرنا ان پر احسان اور اردو خوانوں کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔ اس لئے وہ دیباچہ نویسوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ شملہ بمقدار علم رکھیں۔ چلّو بھر پانی میں گز بھر نہ اچھل پڑیں۔ وہ درست فرماتے ہیں کہ عالم وہی ہے جس کا انداز عمر بھر طالب علمانہ رہے۔ بڑے بڑے دعوے کرنا اور ایک دفعہ قلم سے جو نکل جائے اسے نظر ثانی تک کا محتاج نہ سمجھنا جہالت کی نشانیاں ہیں۔ لنکن کا قول ہے۔ "کچھ لوگوں کو ہمیشہ کے لئے اور سب لوگوں کو تھوڑے عرصہ کے لئے دھوکہ دے سکتے ہو۔ لیکن سب لوگوں کو ہمیشہ کے لئے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

اپنے مضمون "انارکلی"۔ مخلص صاحب اور ہم نیازمند" میں پطرس نے "مخلص صاحب" کی جہالت کو طشت ازبام کیا۔ ان صاحب نے "انارکلی پر ایک نظر" کے عنوان سے ساقی میں ایک مضمون چھپوایا تھا جس کا رقبہ ساڑھے آٹھ صفحے ہے لیکن فی مربع میل کے حساب سے خیالات کی مقدار سائبریا کی آبادی سے زیادہ نہیں۔ جہاں تک بدگوئی کا تعلق ہے۔ مضمون نگار صاحب ہر سطر میں گز گز بھر اچھلے پڑتے ہیں۔ لیکن جہاں تک تنقید کا تعلق ہے وسعتِ ظرف چلّو بھر سے بھی زیادہ نہیں۔ اور چلّو بھی ایسا جس میں وہ خود باوجود اپنی سبک خیالی کے ڈوب مرنے سے قاصر ہیں۔ (۱)

پطرس لکھتے ہیں کہ اس تنقیدی مضمون میں انارکلی کے اصل موضوع کو مخلص صاحب نے چھوا تک نہیں اور فروعی باتوں ہی میں الجھے رہے۔ خود انارکلی کے کیریکٹر کے متعلق کچھ نہ لکھا جو ڈرامے کی جان ہے اور جس کے اردگرد تمام واقعات وکوائف کی تنظیم کی گئی ہے۔ مناظر کی تقسیم کے متعلق کچھ نہ لکھا، واقعات کے تناسب کے متعلق کچھ نہ لکھا۔ ٹریجڈی کی مختلف کیفیات کے زیر و بم کے بارے میں خاموش ہے۔ اردو ڈرامہ کی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر نہ لکھا کہ انارکلی کا ڈرامہ کہاں تک رسمی ڈرامے کا ممنون ہے۔ اور کہاں پرانی قیود کو توڑتا نظر آتا ہے۔ اس بات پر بحث نہ کی۔ اگر یہ ڈرامہ سٹیج پر دکھایا جائے تو کیا دقتیں پیش آئیں گی۔ پیشہ ور سٹیج اس کو کہاں تک قبول کر سکتی ہے

(۱) انارکلی۔ مخلص صاحب اور ہم نیازمند از نیازمندان لاہور، نقوش پطرس نمبر صفحہ ۵۴۴

اور کیوں؟ کسی اور ٹریجڈی سے مقابلہ نہ کیا۔ یہ نہ بتایا کہ اردو ڈرامے کی موجودہ حالت کیا ہے اور اس میں انار کلی کس حد تک ترقی یا تنزل کا موجب ہوگا۔" اس کے باوجود مخلص صاحب یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ ارسطو کے بعد اگر کسی نے ڈرامے کی تنقید لکھی ہے تو ہمیں نے لکھی ہے۔"

اپنے مضمون "ہمارے زمانے کا اردو ادیب" میں پطرس نئے دور کے ادبی تقاضوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہمارے لکھنے والوں کی اکثریت اپنی روایت سے دور ہوتی جا رہی ہے ہمارے ادیبوں کے پاس نہ چھننے اور چھانٹنے کی فرصت ہے نہ کسی چیز کو پڑھنے کی۔ ہمارے دور کا نصاب بھی الجھا ہوا ہے۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کی تو تحریک ہی پیدا نہیں ہوتی۔ بقول پطرس ہمارے زمانے کے اردو ادیب کا مستقبل ہو تو ہو۔ ماضی کوئی نہیں۔

نئی پود کا سب سے بڑا تقاضا بغاوت ہے۔ رسم و رواج کے خلاف، قوت اور اختیار کے خلاف، والدین اور پولیس کے خلاف، وہ قدیم انبیاء اور شعراء دونوں سے بھاگتا ہے۔ بلکہ ہر اس چیز سے جو اسے ماضی کی یاد دلائے۔ یہ جنگ کبھی کبھار دھندلی اور غیر واضح بھی ہو جاتی ہے اور پرکار کے نقطے آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ مگر ایسا تو ہر جنگ میں ہوتا ہے (۱)

پطرس کہتے ہیں کہ ماضی سے دست بردار ہو کر ہمارے ادیب نے اپنی تخلیقی شخصیت پر ایک بوجھ ڈال دیا ہے۔ جس سے اس کی فنی مشکلات دو چند ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کو بیک وقت نازک اور اکھڑ، واضح اور دھندلا، گومگو میں گرفتار اور ہزار معنوں میں مضطرب دیکھتے ہیں۔ اس مقام پر وہ آرتھر کیسٹلر کے حوالے سے تورگنیف کے لکھنے کی واردات سناتے ہیں۔ روایت ہے کہ وہ اپنے پیروں کو گرم پانی کی بالٹی میں ڈالے ہوئے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا تھا۔ یہ گرم پانی کی بالٹی، کیسٹلر کے نزدیک، الہام یا تخلیقی سرچشمے سے عبارت تھی۔ اور کھلی کھڑکی سے مراد باہر کی دنیا تھی۔ جو تورگنیف کے لئے خام مواد کا کام دیتی تھی۔ اس حوالے سے کیسٹلر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ باہر کی دنیا ادیب کے دل میں ایک زبردست خواہش کو جنم دیتی ہے۔ یعنی یہ

---

(۱) "ہمارے زمانے کا اردو ادیب" از پطرس بخاری ترجمہ مظفر علی سید، نقوش پطرس نمبر صفحہ ۳۲۴

کہ وہ کھڑکی بند کر کے بیٹھ جائے اور اپنے تخلیقی سرچشمے پر اکتفا کرے۔ مگر اس کے علاوہ بھی ایک خواہش پیدا ہو سکتی ہے۔ باہر کی ہوا، دباؤ ڈالنے کی بجائے اس کو باہر بھی کھینچ سکتی ہے تاکہ وہ گرم پانی سے اپنے پیر نکال کر کھڑکی پر جھک جائے۔

ہمارے اردو ادیب کو بازار کے واقعات سمجھنے یعنی مشاہدہ اور مرکزیت پیدا کرنے کی ضرورت کچھ اس شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اس کو اکثر و بیشتر کھڑکی پر جھکا دیکھ کر ہمیں حیرانی نہیں ہونی چاہیئے۔ باہر منظر اس کے لئے اتنا دلفریب نہیں ہوتا ہے کہ وہ چیخنے چلانے سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔ وہ لکھنے کی میز پر واپس نہیں آتا اور گرم پانی پڑا پڑا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے ایک نئی دُنیا ابھر آئی ہے۔ دیکھنے اور سمجھنے کے لئے بے شمار چیزیں ہیں اور چھانٹنے کے لئے بے پناہ مسالہ ہے۔ اس حالت میں اس سے عظیم فن پاروں کی توقع بے جا ہے۔ اور یہ امید بھی عبث ہے کہ وہ اپنے پیر گرم پانی میں ڈالے رکھے گا (۱)

---

(۱) ہمارے زمانے کا اردو ادیب، از پطرس نقوش پطرس نمبر ص ۳۴۸

پطرس بحیثیت انشا پرداز

پطرس کے انشائیے، ادب لطیف کے تمام تقاضے پورا کرتے ہیں۔ پڑھنے والا ان کے حسن میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ اس پر سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ نئی ترکیبیں اور نئے استعارے سامنے آتے ہیں جو دل کو موہ لیتے ہیں۔ اس کے اندر اتر جاتے ہیں۔

وارفتگی جذبات کے عنوان سے وہ اپنے جذبات کو نوک قلم سے یوں آشنا کرتے ہیں:-

کہیں دور چند غریب مزدور رباب بجا رہے ہیں اور پشتو کے کسی دردناک گیت کی فراق زدہ نوا، رباب کی سادہ موسیقی، رات کی تنہائی اور خاموشی دل کے تاروں میں ایک دھیمے سے درد کا نغمہ چھیڑ دیتی ہے۔ مضطرب روح کوہستان کے درشت، عشق و حسن کی داستان سن کر اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ . . . . . .

مجھے اس وقت ایک عجیب دورافتادگی، ایک غربت، ایک بے کسی کا احساس ہوتا ہے گویا ایک درماندہ اور راہ گم کردہ مسافر ہوں۔ نظر کو سوائے افق کی ناشکستہ لکیر کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اور کان نے منزل سے مایوس کر دیا ہے۔ گویا میں صحرا کی وسعت اور آسمان کی پہنائی میں ایک ذرہ ہوں اور ستاروں کی دور دراز دنیا تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں۔ چاند کھجور کے درختوں کے ایک جھنڈ میں سے چمک رہا ہے۔ اور کائنات میں یا چاندنی ہے جو چپ چاپ خاموشی سے برس رہی ہے۔ یا تاریک سائے ہیں جن میں رات نے اپنے پُراسرار اقتدار کی ہیبت کو چھپا رکھا ہے۔ فضا میں اس درد کے گیت نے ایک بےعدیم بے قراری پیدا کر دی ہے۔

رفتہ رفتہ رباب کی موسیقی دھیمی ہو جاتی ہے۔ اور گیت میں لے آہستہ آہستہ

چاندنی میں تحلیل ہوکر خاموش ہوجاتی ہے۔ رات کا طلسم جذبات کی سردی پر سکون کی چادر ڈال دیتا ہے۔ آنسو پلکوں پر سوکھ میں ارجسم آجائے۔ تو ہوا کے جھونکے تھپک تھپک کر سلا دیتے ہیں۔ نیند آہی جاتی ہے مگر آہ! کس بیداری کے بعد!! (۱)

پطرس، بے حد حساس انسان تھے۔ اپنی بے بسی اور مجبوری کے حوالے سے وہ محسوس کرتے ہیں کہ ایک زبردست کشش، ایک ہمہ گیر جاذبیت، انہیں ہلاکت اور پستی کی طرف کھینچے لئے جارہی ہے۔ انہیں خدشہ ہے کہ صورت حال میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہ ہوئی تو انکے حیات فنا ہوجائیں گے۔ اور ان کے حواس جواب دے جائیں گے۔ وہ اپنے جذبات کو اپنے مضمون "تنزل" میں یوں رقم کرتے ہیں۔

" میں اپنے آپ کو زندہ کہتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مردوں سے بدتر ہوں کیونکہ جو شخص مرجاتا ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں ٹھکانے تو لگ جاتا ہے۔ اور میرا حال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ آرام وسکون میرے لئے ناممکنات سے ہیں۔ نہ مجھے اس وقت کوئی ناصح مفید ہوسکتا ہے اور نہ میں خود ہی اپنی رہنمائی کرسکتا ہوں۔ چارہ گر کو مجھ پر رحم آسکتا ہے اسے میرے نزدیک آنے کی ہمت نہیں پڑسکتی۔

زندگی میں یہ ایک . . . . . . صرف ایک لغزش کا نتیجہ ہے۔ آپ نہیں سمجھے؟ خوب! بات یہ ہے کہ میں جامع مسجد کے مینار سے گر رہا ہوں" (۲)

اپنے مضمون "آئینہ دل" میں لکھتے ہیں کہ اٹھتی جوانی کا عالم انہیں یوں دکھائی دیتا ہے، جیسے ایک دریا جس کی گہرائیوں کے طلاطم پر سطحی سکون بے خبر سا مسکرا رہا ہو۔ جس کے اعماق کی تاریکیوں میں لہریں اٹھتی ہوں اور سطح کو چھوکر واپس ڈوب جاتی ہوں۔ جہاں ایک طلاطم پنہاں ہو اور ایک محشر فروائی۔

---

(۱) "دارفتگی جذبات" از پطرس مخزن جولائی ۱۹۲۱ء
(۲) "تنزل" از پطرس مخزن اکتوبر ۱۹۲۱ء

پطرس کی انشائے لطیف کا ایک اور نمونہ اسی مضمون میں ملاحظہ ہو لکھتے ہیں کہ گیت کی دردناک لے جب تاروں میں ایک بے قراری، ایک وجد کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جب سر اپنی جان سے بیزار ہو کر بے حجابانہ اور بے تابانہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ جب بربط کی جانِ نازک اپنی بساط سے بڑھ کر چیخ اٹھتی ہے تو اس کے تار ٹوٹ جاتے ہیں شکستگی نغموں کا خاتمہ کر دیتی ہے پھر وہ بربط، بربط نہیں رہتا۔ بلکہ فنا کا ایک خاموش نوحہ ماتم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے عشق کی نامرادی ①

اپنے مضمون "آسمان" میں پطرس اپنی حدیثِ دل سناتے ہوئے اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ ایک بے نام بے چینی انہیں نیند سے ناآشنا کئے رکھتی ہے۔ دل ایک خاموش اور بے نوا اضطراب بن کر آنکھوں میں بھر آتا ہے۔ کسی تنہا، آہستہ خرام رہگیر کی سریلی تان رات کی گہری تاریکی میں سے چھن کر ان تک ایک رقیق سی بے قراری اور ایک خفیف سی لرزش ہو کر پہنچتی ہے۔ درختوں میں ہوائی سرسراہٹ قدرت کے عالی شکوہ گنبد میں کسی سانپ کی پھنکار کی پُر اسرار گونج معلوم ہوتی ہے۔ گویا فطرت کی آہ سرد ہے یا الہام کی سرگوشی، جو ایک عظیم الشان کائنات کے خاموش اندوہ اندھیرے اور تاریک اندوہ کے راز سے انہیں غرق تحیر کر رہی ہے۔ ستاروں میں ایک ابدی روشنی چمکتی نظر آتی ہے۔ کالے آسمان کی مہیب سیاہی ایک لازوال اور ہمہ گیر غم کی طرح دنیا و مافیہا پر چھائی ہوتی ہے اور ستارے اس غیر محدود بلندی پر آگ کے قطروں کی طرح معلق و لرزاں معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ اس دور دراز بلند اور پُر ہیبت عظمت کے نیچے ایک ذرۂ حقیر اور ایک روح بے مایہ کی طرح گم ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک ستارہ رات کا ایک خاموش اور بے بہا آنسو ہے۔ جو صبح کے وقت زمین کے کسی پھول کی پتیوں پر سورج کی کرنوں میں مسکرا رہا ہو گا۔ آسمان ایک بھیانک غم کی طرح ہر ایک طرف طاری دکھائی دیتا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس میں کھویا ہوا پاتے ہیں۔ جب کوئی ٹوٹتا ہوا تارا ایک وارفتہ سرعت کے ساتھ آسمان کی وسعت و پہنائی پر ایک افق سے لے کر دوسرے افق تک ایک طویل خطِ آتشیں کھینچتا ہوا تاریکی میں

---

① " آئینۂ دل" از پطرس مخزن نومبر دسمبر ۱۹۲۱ء

کہیں فنا ہو جاتا ہے۔ تو وہ آسمانی زلزلے سے خوفزدہ ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔
اس وقت وہ قدرت سے رحم کے طلبگار ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ اپنی تمام زندگی میں آنسوؤں کے سوا اور کوئی چیز آسمان کے حضور میں پیش نہیں کر سکتے۔ ان کے ہونٹوں پر ایک مہر سکوت ہوتی ہے۔ اور ان کی روح ایک حیرت بن کر رہ جاتی ہے۔ اس وقت وہ آسمان کی سیاہ وسعت درخت کو دیکھ کر بھول جاتے ہیں کہ ازل اور ابد میں کیا فرق ہے۔ (۱)

ایک اور مضمون "ایک رات" میں اپنے تاثرات کو رقم کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ وہ ڈراؤنی کالی رات سے ڈرتے ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہیں ان کے حواس اس کی ہوشربائی کے بے حد طلسم سے مسحور ہو کر رات کی تاریکی کے ساتھ نہ مل جائیں۔ اور وہ اس سکوت کے سمندر میں آہستہ سے ڈوب کر غائب نہ ہو جائیں۔ انہیں صرف لمبے لمبے بکھرے ہوئے گھنے سیاہ لہروں والے بال دکھائی دے رہے ہیں اس حسین کی مانند کہ جس نے اپنا چہرہ دوسری طرف چھپا لیا ہو۔ ان کی ڈراؤنی سیاہی پطرس کی آنکھوں میں چھا رہی ہے۔ حسن ان کی آنکھوں سے اوجھل ہے...... وہ چاہتے ہیں کہ کسی چیز کو نہ دیکھیں اور رات کی خاموشی اور ان کے سکون میں کوئی اضطراب پیدا ہو جائے لیکن وہ اپنے آپ کو کسی جادو میں جکڑے ہوئے پاتے ہیں۔ جو ان کی آنکھوں کو زور سے کھولے ہوئے ہو جو ان کے سینے کو دبا رہا ہو اور جو انہیں سانس نہیں لینے دیتا ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے کائنات چاروں طرف سے آہستہ آہستہ آگے کو بڑھ کر انہیں بھینچنے کے لئے ان کی طرف بڑھ رہی ہو اور خاموشی اور تاریکی کے جادو نے انہیں اس تنہا بھیانک موت کے لئے یہاں باندھ رکھا ہو (۲)

مضمون "مینہ برس رہا ہے" میں وہ اپنی محبوبہ سے یوں مخاطب ہیں کہ بارش کی چلمن میں سے کائنات کی دنیائے موہوم انہیں دکھائی دیتی ہے۔ درخت جھومتے ہیں۔ ان کی لرزش میں انہیں اپنے محبوب کا تبسم نظر آتا ہے۔ بجلی چمکتی ہے۔ تو وہ سمجھتے ہیں کہ اُس دنیا سے کوئی پیغام آیا۔ پرندے چہچہاتے ہیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ مل کر گانا چاہتے ہیں۔ تاکہ ان کے نغموں کی نکہت کائنات کے

(۱) آسمان از پطرس بخاری "مخزن" جنوری ۱۹۲۳ء (۲) "ایک رات" از پطرس بخاری مطبوعہ "نیرنگِ خیال"

"ادب اور فن کو خدا نے وہ لہو بخشا ہے کہ باوجود آنکھ سے ٹپکنے کے رگوں میں دوڑنے پھرنے سے باز نہیں آتا۔ آپ نے سُنا ہو گا کہ عین میدانِ جنگ میں پھول اُگتے ہیں جب شاعری زندگی کا دار و مدار ایک جاہل اور جابر سلطان پر تھا جب بھی اس نے ایسے حیلے تراش رکھے تھے کہ مدح کے علاوہ کئی راہیں اس پر کھلی تھیں۔" (١)

---

(١) "پطرس کے خطوط" مطبوعہ مکتبہ اردو ادب لاہور

پطرس اور فنِ دیباچہ نویسی

پطرس نے متعدد کتابوں کے دیباچے بھی لکھے ہیں۔ نتیجہ خیز بات کرنے، فن کی باریکیوں اور اس کی تہ تک پہنچنے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ان کے لکھے ہوئے دیباچوں کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

مولانا عبدالمجید سالک کی کتاب "چمپا اور دوسرے افسانے" پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: کہ سالک کی تحریر، سازِ دل میں ضرور کوئی نہ کوئی تار ایسا چھیڑ جاتی ہے، جو نغمے کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی تھرتھراتا رہتا ہے۔ انہیں پڑھ کر بارہا یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے ان افسانوں میں ایسے تار بھی موجود ہیں جنہیں کسی مضراب نے کبھی نہیں چھوا۔ مگر جو پھر بھی ہم آہنگ ہیں۔ اور کانپ رہے ہیں۔ سالک کو انتہائے جذبات کے اظہار کا بہت شوق تھا۔

پطرس کے بقول، سالک کا دل حیات کی نزاکتوں اور جذبات کی لطافتوں سے مملو تھا۔ ان کے سینے میں بے شمار ہلکے ہلکے درد اور ہلکی ہلکی ٹیسیں بھی اٹھتی تھیں۔ مگر غضب یہ تھا کہ وہ آفات و مصائب کو دلیرانہ برداشت کرنے والے ایک جوانمرد کی مانند اس شعریت کو اپنی فطرت کی کمزوری سمجھتے تھے۔

"ہلالِ عید" جو ان کے قلم کی بے ساختگی اور بے تکلفی اور ان کی طبیعت کی نازکی کا بہترین نمونہ تھی۔ ایک ایسی سرگوشی تھی، جو کبھی بلند آہنگ نہیں ہوئی تھی۔ پطرس لکھتے ہیں کہ سالک بارہا ایک لفظ سے وہ کام لیتے تھے جس کے سرانجام دینے میں ہندوستان کے اکثر انشا پردازوں کے بلیغ فقرے ناکام رہتے تھے۔ الفاظ میں وہ موسیقی اور شیرینی بھر دیتے تھے، جو صورت کو معنی سے زیادہ دلآویز بنا دیتی تھی۔

پطرس نے حفیظ جالندھری کی کتاب "نغمہ زار" پر بھی ایک مختصر تبصرہ رقم کیا ہے۔ لکھتے

ہیں کہ حفیظ کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی نیرنگیاں تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگتی ہیں، ساون رت گھنگھور گھٹاؤں میں کھیلتی ہوئی۔ بجلی، پپیہوں کی پکار، برسات کی ٹھنڈی ہوا، ہوا میں اڑتے ہوئے آنچل، آنکھوں میں تمنائے دیدار اور فراق کے آنسو، دل کو انتظار کی دھڑکن، پطرس کے بقول یہ ایک مستِ کیف شاعر کی وہ دنیا ہے جس میں حفیظ گاتا پھرتا ہے۔ جب اس کا دل بھر آتا ہے تو وہ آنسو بہا دیتا ہے جب اس کے دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے تو وہ اونچے سروں میں الاپتا ہے اور سننے والوں کا کلیجہ مسل دیتا ہے۔

نغمہ زار کے مطالعہ کے بعد ہم جان سکتے ہیں کہ ایک وارفتہ عاشق مزاج عشق کے اتھاہ سمندر میں خود بھی ڈگمگاتا ہے اور دوسروں کے دل بھی ہلاتا ہے۔ حفیظ ایک ایسا شاعر دکھائی دیتا ہے جس کے پاؤں رستے سے ادھر ادھر جا پڑتے ہیں۔ لیکن یہ ایک راہ گم کردہ کی آوارگی نہیں۔ ایک مست کی لغزشیں ہیں۔ نشے میں چور، کیف میں سرشار، جو پیتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔ پیالے میں بھی بھر دیتا ہے اور یوں بھی لنڈھاتا ہے۔ ایک آزاد جو گاتا ہے اور الفاظ اس کی زبان پر ناچنے لگتے ہیں

پطرس کے بقول حفیظ کی نظر ہندوستان کی دلہن پر ہے اور وہ اس جھلک پر فدا ہے، جو باریک آنچل میں سے دکھائی دیتی ہے لیکن ابھی وہ ترکِ شیرازی کی غلامی سے بالکل آزاد نہیں ہوا اور اس کو انکھیوں سے کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے۔

صوفی تبسم کی کتاب "جھولنے" پر تبصرہ کرتے ہوئے پطرس لکھتے ہیں کہ صوفی تبسم ایک خوش ذوق، سخن سنج اور سخن گو شاعر ہیں۔ وہ اردو فارسی غزل استادانہ کہتے ہیں اور جذبے اور ادا کی باریکیوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ اس کتاب میں صوفی تبسم کی پختہ کاری اور طباعی کے شواہد جا بجا نظر آتے ہیں۔ آخر میں پطرس دعا کرتے ہیں کہ صوفی تبسم کا یہ بچپن ہمیشہ قائم رہے

تاکہ ان کے قدردان ہمیشہ انہیں یہ کہنے کے قابل ہوں کہ ؎

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت
مزاجِ تو از حالِ طفلی نہ گشت

ن۔م۔ راشد کی کتاب 'ایران میں اجنبی' پر تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے پطرس رقمطراز ہیں کہ دورِ جدید کے اکثر شعراء نے راشد اور فیض جیسے معدودے چند باغیوں سے ہی ہدایت پائی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان مشاہیر کی تربیت میں نئے نئے علوم کو دخل ہے جس سے انکے متقدین بے بہرہ تھے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دورِ جدید کے ذہنی اور معاشرتی طوفانوں اور زلزلوں کی بدولت ان مشاہیر کو ایک نئی آگاہی نصیب ہوئی ہے اور انہوں نے وہ افق دیکھے ہیں جو اس سے قبل نظروں سے اوجھل تھے۔ انہی شعراء کے طفیل لاتعداد شاعروں کی ہمت بڑھی ہے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ راشد کے اسلوب بیان میں کچھ ایسا نشہ ہے کہ ان کے بعض متقدین کچھ زیادہ ہی بدمست ہو گئے۔ اور اس عمل میں وہ توازن اور اعتدال کی حدیں بھی پھلانگ گئے ہیں۔

پطرس لکھتے ہیں کہ راشد کا مزاجِ شاعری بہت حد تک شوکت و شدت سے رنگ پکڑتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ راشد کی شاعری پختگی کے اس درجہ تک جا پہنچتی ہے۔ جہاں درشتی سے ان کا قلم ناآشنا ہوا جاتا ہے۔ ان کی نظمیں قسم قسم کے نقوش کا مجموعہ ہیں۔ اور براوننگ کی مانند ان کی تخلیق ایسی ہے کہ اُبلتے چشمے کے پانی کی طرح ہر چھوٹے پتھر کو درآنہ دھکیلتی چلی جاتی ہے۔

ناجرہ مسرور کی کتاب "چھپے چوری" کے دیباچے میں پطرس لکھتے ہیں کہ ہاجرہ مسرور کا یہ مجموعہ تازہ ہوا کا ایک جھونکا ہے اس مجموعہ میں مصنفہ نے اپنی فطرت کو خوب نبھایا ہے۔ ان کی نظر بلند اور گہری ہے۔ وہ شخصی اور ذاتی رشتوں کے حوالے سے بات کرتی ہیں۔ ان رشتوں کی دنیا بھی ایک حیرت انگیز دنیا ہے جس میں انسان ایک دوسرے کو کھینچتے بھی ہیں اور دھکیلتے بھی ہیں اور یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہاتھ سے کھینچتے اور دوسرے سے دھکیلتے ہیں۔ اور زندگی

اس جال میں تنی تنی سی رہتی ہے۔ شوپن ہار کا قول نقل کرتے ہوئے پطرس فرماتے ہیں کہ انسانوں کی مثال ان خارپشتوں کی سی ہے جنہیں سردی لگ رہی ہو۔ ٹھٹھرنے لگتے ہیں۔ تو گرم ہونے کو ایک دوسرے کے قریب سرک آتے ہیں۔ کانٹے چبھتے ہیں تو ایک دوسرے سے پرے ہٹ جاتے ہیں اور پھر ٹھٹھرنے لگتے ہیں۔

پطرس لکھتے ہیں کہ ہاجرہ مسرور ہمارے کئی افسانہ نگاروں سے زیادہ حساس اور نازک بین ہیں۔ ان کی نظر دور تک پہنچتی ہے۔ اور ان کے افسانوں میں اکثر گہرائیاں ایسی آجاتی ہیں جو اور افسانہ نگاروں میں نہیں ملتیں۔ ہاجرہ کے کرداروں کا جنسی شعور جسمانی مظاہرے سے بہت آگے نکل جاتا ہے۔ اور ہاجرہ کے احساس میں کئی نزاکتیں اور پیچیدگیاں دکھائی دیتی ہیں، جن کی وجہ سے ان کے جنسی افسانے اوروں سے زیادہ دقیق اور عمیق معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے جنسی تعلقات میں تنوع اوروں سے زیادہ ہے اور ان تعلقات کی رنگتیں بھی زیادہ لطیف اور نگاہ فریب ہیں۔

پطرس کے خیال میں ہاجرہ کی زبان جیتی جاگتی زبان ہے جو سیدھی مطلب کی طرف لپکتی ہے۔ اترا اترا کر اپنی طرف دیکھتی نہیں رہتی۔ اور اس الھڑپن کی وجہ سے بے تکان وہ باتیں کہہ جاتی ہے جو مصنوعی ادبی زبان کے منشیانہ گلے میں اٹک کر رہ جاتیں یا بڑے تکلف سے ادا ہوتیں۔

ہاجرہ کی تشبیہیں بیشتر انوکھی اور جذبے یا خیال کے ساتھ ہی بے تکلف ان کے ذہن میں چلی آتی ہیں پطرس کہتے ہیں کہ جس ادیب کو اپنی سوچی ہوئی، اپنی دیکھی ہوئی، اپنی بیتی ہوئی بات کہنی ہو اس کا کام گھڑی گھڑائی تشبیہوں سے نہیں چل سکتا۔ جو ادیب گھڑی گھڑائی تشبیہیں استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے دل کی بات ٹھیک طرح سے نہیں کہہ پاتے۔

پطرس خطوط کے آئینے میں

پطرس بخاری بڑے اچھے خط لکھتے تھے۔ ان کی شخصیت کے بڑے دل آویز خط وخال ان خطوط میں جلوہ گر ملتے ہیں۔ اچھے خطوط وہی لکھ سکتا ہے جس کو مکتوب الیہ سے اخلاص اور اپنے آپ پر اعتماد ہو۔ محبت کی سب سے معتبر علامت یہ ہے کہ عاشق اپنے راز محبوب پر ظاہر کرنے لگے۔ خط لکھنے کا فن وہ فن ہے جہاں تکلّف یا تصنّع خط لکھنے والے کو لے ڈوبتا ہے (Safety First) یا (Self First) کے بندے کبھی اچھے خط لکھنے والے نہیں ہو سکتے۔ آمیز شے کتنی گہرے پاک او نچا" کا اطلاق خط نگاری کے فن پر بھی ہوتا ہے۔

پطرس کے خطوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی معلومات کتنی وسیع اور جامع، مشاہدہ کتنا تیز، ذہن کتنا زرخیز، تاثرات کتنے گہرے، تخیل کتنا نادرہ کار، اور بات کہنے کے انداز میں کتنی شوخی شیرینی اور تازگی تھی۔ ان کے خطوط سے یہ حقیقت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اپنے دوستوں سے انہیں کتنا پیار تھا۔ وطن سے دوری اور اپنی تنہائی کا احساس بھی قاری کے ذہن پر گہرا تاثر مرتب کرتا ہے۔ اتحاد ملت اسلامیہ کے بارے میں بھی ان کے نظریات واضح شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔

آیئے اب دوستوں کے بارے میں پطرس کی گرم جوشی کی ایک جھلک آپ کو دکھائیں۔

۱۴ اگست ۱۹۵۱ء کو نیویارک سے عبدالمجید سالک کے نام لکھتے ہیں۔

"آپ کو خط لکھنے سے طبیعت کا "یخ" ٹوٹا تو سلیمان صاحب کو بھی ایک خط لکھ دیا۔ اگر انہیں جواب کی توفیق ہوئی تو دل میں لہو کی ایک اور بوند نظر آنے لگے گی۔"

پھر ۱۶ ستمبر ۱۹۵۱ء کو سالک سے یوں مخاطب ہوتے ہیں "چند دن ہوئے میں نے امتیاز

کو خط لکھا تھا۔ جواب سے حسبِ معمول محروم ہوں۔ اور شاید محروم رہوں اور کچھ نہیں۔ تو کم از کم میری محرومی ہی کا احساس ان تک پہنچا دیجئے کہ عشق کے کاروبار میں اس سے بھی بسا اوقات فائدہ پہنچتا ہے۔"

سالک کے نام ایک اور خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"احباب کی یاد ابھی تازہ ہے۔ مجید لاہوری اور دیگر کرمفرماؤں کو سلام پہنچے ؎

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی
جو روشنی کہ شام سوادِ وطن میں تھی

"شام" سے مراد وہ شام ہے جو آپ کے ہاں کٹتی تھی اور "سواد" پنجابی کا "سواد" ہے۔

"مجید (لاہوری) صاحب کو خدا نے شرافت اور شرارت کا جو نسخہ بتایا ہے۔ وہ دل کی گرمی اور دماغ کی ٹھنڈک کے لئے بہترین نسخہ ہے۔ انہیں میرا سلام شوق کہیئے گا۔ یقین مانیئے نمکدان پہنچا۔ تو میں نے اس کے بعض حصے پانچ چھ مرتبہ اور سنائے۔ ان کی بدولت میں تو بالکل ہی نمک خوار ہو گیا ہوں۔"

چراغ حسن حسرت کا تذکرہ کرتے ہوئے سالک کو لکھتے ہیں۔ "اور ہاں۔ وہ مردِ مومن جس کا نام "گر نہیں وصل تو" ہے۔ آج کل کس شغل میں مصروف ہیں؟ ان کی کبھی کوئی خبر نہیں آئی! اگر سالک بے خبر نہیں۔ وہ ضرور سجادہ رنگین کر رہے ہوں گے۔ خدایا ان کا کیف کم نہ باد!

اور سالک کے نام لکھے ہوئے خطوط سے مزید اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"اب کے آپ نے طویل خاموشی کے بعد خط لکھا۔ خط لکھنے کے معاملے میں آپ نے کچھ موسموں کا رتبہ حاصل کر لیا ہے۔ دو چار دن سے زیادہ اِدھر اُدھر نہیں ہوتے۔ اس لئے بارانِ کرم میں غیر معمولی تاخیر ہو تو ہم مرجھانے لگتے ہیں۔"

"عنقریب ایک اور خط بلا وجہ لکھوں گا۔" ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے۔"

"سُنا ہے بے نیاز لاہور واپس آگیا ہے۔ نہ خط لکھتا ہے۔ نہ ملتا ہے۔ دہلی سے شمال جنوب

کو گذر جاتا ہے ۔ اور ہم سے نہیں ملتا ۔ جیسے عصمت بچائے پھرتا ہو ۔ بیٹے ۔ تو ڈانٹیئے گا۔"

" ...... مجگل لاہور میں د جانے کب تک ہے ۔ امتیاز کی یکسوئی کی کئی داستانیں سُنتا ہوں ۔ لیکن ایک سالک ہے جس کا حُسن کلو پٹرا کی طرح بقول شیکسپیر مرورِ زمانہ سے اثر پذیر نہیں ہوتا ۔ میرے لئے لاہور اگر کسی شخص کا نام ہے تو وہ آپ ہیں "

" ہم کو از حد ناگوار گزرے گا کہ آپ آئیں بھی تو اس طرح کہ گھڑی دو گھڑی کو مل بیٹھنا بھی نصیب نہ ہو ۔ دن بھر سب لوگ معاش کے مخمصوں میں گرفتار رہتے ہیں ۔ جب تک مو تین شامیں میسر نہ ہوں ۔ ہم تشنہ کاموں کی کیا تسلی ہوگی "

" دوستوں کی صحبت سے پھر روح و دماں کو سیراب کرنے کے لئے بے قرار ہوں اور دن گن رہا ہوں "

اور اب عبدالرحمٰن چغتائی کے نام لکھے ہوئے خطوط سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں ۔

" لاہور کا قیام از حد مختصر تھا ۔ جہاں برسوں تک شباب رنگین کیا ہو اور بڑھاپے کو بھی شباب بنایا ہو ۔ وہاں دل کی تشنگی ہفتے عشرے میں کیا بجھتی ۔ لیکن قسمت پر نازاں ہوا ۔ کہ احباب کی صحبت میں مسرت بلکہ نشے کی چند گھڑیاں تو گزار لیں ۔ آپ سے سالہا سال دل کا سودا رہا ہے ۔ آپ کی محبت اور اخلاص برسوں سے دل کا جزو تھیں ، اور ہیں ۔ الحمدللہ کہ آپ سے مل لیا اور آپکی محبت اور آپ کے کرم سے دوبارہ فیض یاب ہوا "

" کس کس کا ذکر کروں ۔ پورے گلزار کو حسرت و عشق کا پیغام پہنچانا ہو تو کہاں تک ایک ایک پھول کا نام لوں ۔ جو ملے ۔ ان سے کہئے ۔ کہ غریب الوطن سلام کہتا ہے "

" کبھی صوفی ملیں تو ان سے کہیئے ۔ کہ دو گھونٹ میری یاد میں بھی پی لیں ۔ کمبخت کبھی خط بھی لکھنے کے روادار نہیں اور ہم ہیں کہ ہر دا گھند سے ان کا ذکر فخر سے کرتے ہیں ۔ اور ان کی خیریت بے قرار ہو کر پوچھتے ہیں "

بیگم آمنہ مجید ملک کے نام نیویارک سے ۱۵ ستمبر ۱۹۵۱ء کو لکھتے ہیں :

"احباب کی یاد کبھی دل سے محو نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کوئی لطیفہ کانوں تک پہنچ جاتا ہے تو طبیعت دن بھر کو رنگین ہو جاتی ہے ورنہ اکثر یہ کیفیت رہتی ہے کہ اماں میرے بھیا کو بھیجو ری کہ ساون آیا"

امتیاز علی تاج سے مخاطب ہوتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"میں تمہارا ایک حقیر دوست ہوں، بے بس اور دور افتادہ۔ لیکن اگر میری محبت تمہارے کسی کام آسکتی ہے تو یقین جانو کہ وہ تم سے نہ کبھی دریغ رکھی ہے نہ رکھ سکتی ہے۔ میرا عمر بھر کا تجربہ اور خود میرا رجحان طبیعت یہ کہتا ہے کہ دنیا میں دوستی سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں، اسی لئے کوئی دوست چھن جائے یا دور ہو جائے تو میں کئی راتیں اور کئی دن اس کا ماتم کرتا ہوں۔"

پطرس کے خطوط سے ان کی وطن دوستی اور بھرپور جذبہ قومیت کی روشن مثالیں ملتی ہیں۔ اس ضمن میں سالک کے نام لکھے ہوئے خطوط کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"ہندوستان سے جو تناؤ ہے، اس سے طبیعت متفکر رہتی ہے۔ نہ معلوم نہرو صاحب کے سر میں کیا سودا سمایا ہے کہ حق و راستی اور صلح کوشی سے انہوں نے آنکھیں بند کرلی ہیں۔ شاید آئندہ الیکشن کی ہوس نے فکر و عمل میں کجی پیدا کر دی ہے۔

۔۔۔۔۔۔ خدا ہم لوگوں کا حامی و ناصر ہو۔ پاکستان کی ہمت اور پاکستان کے لیڈروں کی دانائی اور مدبری کے سب لوگ یہاں قائل ہیں اور بیشتر از بیشتر کالم نویس ان کے معترف بنتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن کوئی خدا کا بندہ ہندوستان کے کان نہیں مروڑتا۔ سب اپنا الو سیدھا کرتے ہیں"

"۔۔۔۔۔۔ صاحب آجکل یہاں ہیں۔ مباحثہ کشمیر کے آنے والے سین کے لئے سٹیج تیار کر رہے ہیں اور بے انتہا تگ و دو میں مصروف ہیں۔ خدا کرے ہم اس قضیئے سے عزت کے ساتھ اور بوجہ احسن عہدہ برآ ہوں"

" آج کل کام میں گھرا ہوا ہوں سیکورٹی کونسل ایوارڈز ایڈجسٹمنٹ (Security Council Awards Arrangements) میں ہونے کی وجہ سے مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ پاکستان کے کئی لوہے آگ میں ہیں، ہر وقت یہی لگا رہتی ہے کہ کوئی لوہا ٹھنڈا نہ پڑ جائے۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

" آج یہاں کے اخبار میں خبر چھپی ہے کہ کابینہ میں رد و بدل ہونے والا ہے نیز یہ کہ فوج کے افسروں میں بد دلی ہے۔ اللہ اپنے حفظ وامان میں رکھے اور ہر قسم کی آفت سے بچائے ہم یہاں پاکستان کی بہبود اور پاکستانیوں خصوصاً اپنے احباب واقربا کی بہبود اور سلامتی کے لئے دست بدعا رہتے ہیں۔

میکسیکو سے یوں رقمطراز ہیں۔

" جب یہاں آئے تو کوئی ہمیں جانتا نہ تھا۔ بلکہ اکثر لوگ تو پاکستان سے بھی بے خبر تھے۔ خدا کی مہربانی سے پہلے ہی ہفتے کے اندر دو تین زور دار تقریروں کا موقع مل گیا ساتھ ہی ساتھ میں نے ہسپانوی بھی سیکھنی شروع کر دی۔ کچھ بحث بازی میں کرتب دکھائے۔ موقع پاکر محض تقریر کے زور سے ایک دن انگریزوں کو وہ شکست دی کہ انہیں ستر (۷۰) میں سے پانچ سے زیادہ ووٹ حاصل نہ ہوئے۔ چنانچہ لوگوں کو خیال ہوا کہ بحث وتمحیص میں پاکستان دوستی مفید ہے۔ بہرحال اس کی دشمنی مضر ہو سکتی ہے۔ گاہے گاہے لطیفہ بازی سے بھی کام لیا ایک مزاحیہ نظم انگریزی میں کانفرنس کے بارے میں لکھی جو پارٹیوں کے رستے سے کانفرنس کے روزانہ سرکاری اخبار میں چھپ گئی اور لوگوں نے پاکستانیوں سے موقع بے موقع مسکرا کر مصافحے کرنا شروع کر دیئے۔

..... باہر آکر انسان پہلے سے بھی زیادہ پاکستانی ہو جاتا ہے یہی کیفیت ہماری ہے۔ اب خدا کرے کہ آخری مرحلوں میں ہمیں کامیابی نصیب ہو۔"

میکسیکو سے ایک اور خط۔

" خدا نے یہ معجزہ دکھایا کہ جب ستر ملکوں میں سے صرف پندرہ ملکوں کی ایک کمیٹی بنی تو اس میں پاکستان کو شامل پایا۔ جب ۲۲ اکتوبر کو ہم یہاں پہنچے تو کوئی ہمیں نہ جانتا تھا پاکستان کے نام سے بھی لوگ ناواقف تھے۔ ستر قوموں میں سے سب سے نئی قوم۔ ستر قوموں میں سب سے ناتجربہ کار ملک۔ لیکن پانچ مہینے کے عرصے میں پاکستان کو خدا نے یہ عزت دی کہ ہر اہم کمیٹی اور اہم مشورے میں اس کی حیثیت صدر یا نائب صدر کی سی تھی اور اب جبکہ کانفرنس نے دنیا بھر کی ایک مختصر کمیٹی بنائی ہے تو اس میں بھی پاکستان اس خوبی سے دھرا ہے کہ کسی کو اس کے حق شمولیت پر شبہ کرنے کا خیال تک نہیں آتا .... پہلے لوگ پاکستان کو ہندوستان کا شاگرد اور برخوردار سمجھتے تھے۔ اور جب بھی انتخابات کی نوبت آتی لوگ سمجھتے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں میں سے صرف ایک کا ہونا کافی ہے۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے محسوس کیا کہ پاکستان ہندوستان کا چھوٹا بھائی نہیں۔ تمام مسلم ممالک کا بڑا بھائی ہے۔"

" پاکستان سے لوگ کم واقف ہیں۔ کما حقہٗ پبلسٹی کے لئے کھربوں روپیہ چاہیئے۔ اس لئے جو مواقع مل جاتے ہیں ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اکثر لوگ صاف دل لیکن ہندوستان سے بے حد مرعوب ملتے ہیں۔ تاہم معقول بات کیجیئے تو اثر پذیر ضرور ہوتے ہیں۔"

وطن سے پطرس کی جذباتی عقیدت کے چند اور نمونے ملاحظہ ہوں۔

" وطن یاد آتا ہے۔ طالب علم تھے تو مارچ کے مہینے میں امتحان کے خیال سے رعشہ طاری رہتا تھا۔ معلم ہوئے تو مارچ میں تعطیلات کا انتظار رہتا تھا۔ بہار کی ہوائیں یوں بھی چلتی تھیں اور یوں بھی۔ اور کاروبار عشق بہر نوع جاری تھا۔ کیا اب بھی راوی کے اُس پار مقبرہ جہانگیر کے باغ میں کوئل کی صدا سنائی دیتی ہے ؟ کیا اب بھی فالودے کا موسم قریب آرہا ہے ؟ جب بیماری کے عالم میں بالکل خالی الذہن تھا تو شباب لاہور اور لاہور شباب کے کئی مواقع تھوڑی تھوڑی دیر کو دماغ میں جاگ اٹھتے تھے۔ دارالاشاعت کی بزم عشاق، دہلی مسلم ہوٹل میں واردگان

کا ہجوم، بہدل مرحوم، فرزند علی (جو ہر وقت پان کی وجہ سے رطب اللسان رہتے تھے) منشی نعمت علی کہ بیٹھے ہو" پرانی انارکلی میں حکیم احمد شجاع کا مکان اور باپ کا گناہ، تاثیر کی فیل پائی اور تہمتنی چراغ حسن حسرت ڈیگ پر مچھلی کا شکار، جنگل کی پُر اسرار مصیبتیں پھر گورنمنٹ کالج لاج کا دور، صوفی کی پنجابی غزلیں، شب دیگ کی تقریبیں، اے کاش، کوئی از سرِ نو ان اوراق پریشان کا شیرازہ باندھ دے:

وطن سے محبت کا ایک اور ثبوت ملاحظہ ہو:

جہاں گردی سیر و سیاحت کے لئے خوب ہے۔ لیکن قدرت کو کوئی ایسا انتظام ضرور کرنا چاہیئے کہ انسان بیمار ہو، تو اپنے وطن ہی میں، اور دفن ہو تو اپنی ہی مٹی میں۔ علاج تو یہاں سے بہتر دنیا میں نہیں۔ لیکن روح کے زخم بھرنے نہیں پاتے۔ روح کی مسیحائی احباب ہی سے ہو سکتی ہے۔۔۔

..... یہ آپ خوب اہل دل ہیں۔ وہ کب تک یوں دل کو سنبھالے رہیں گے "

مسئلہ تیونس کے بارے میں بخاری مرحوم کی معرکتہ آلارا تقاریر کی تفصیل آپ کو اس کتاب کے آخری باب میں ملے گی۔ یہاں ایک خط سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے ان کی اس مسئلہ سے وابستگی کا اشارہ ملتا ہے۔ ساتھ ہی وطن سے ان کی عقیدت کی واضح جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔

" جب سے پیرس آیا، مسئلہ تیونس میں مستغرق رہا۔ خدا نے اس بارے میں مجھے ایسا سرخرو کیا کہ ناشکری کا کوئی بھی حیلہ باقی نہیں رہا۔ امریکہ کے اخباروں نے وہ مجھے سر پر اٹھایا کہ شاید ہی یو۔ این۔ او میں کسی کو نصیب ہوا ہو۔ ابھی تک تعریفی خطوط کا تانتا لگا ہوا ہے۔ اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن والے ہر وقت تعاقب میں رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہت نامی اخبار نے خاص مجھ پر آرٹیکل لکھنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ سُنا ہے میرے والے آرٹیکل پر ان کا دس ہزار ڈالر خرچ آئے گا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے پاکستان کی اس خدمت کے لئے مجھے منتخب کیا اور پاکستان کے طفیل مجھ پر اپنی رحمت فرمائی۔ قضیئہ تیونس کیونکر یو۔ این۔ او میں لایا گیا۔ اور

معاملے نے کیا کیا پلٹے کھائے اور دنگل میں کیا کیا تماشے ہوئے۔ یہ داستان ایک ڈرامہ سے کم نہیں۔"

اپنی ملازمت کے غیر یقینی حالات پر وہ دلفگار دکھائی دیتے ہیں، ملاحظہ ہوں چند اقتباسات :

"میں بھی عجیب خوش فہم ہوں۔ اب تک یہی غرّہ تھا کہ اس عہدے پر ہم نے دو خدمت گذاری کی ہے۔ اور رستم کی گور پر وہ لات ماری ہے کہ ہمیں یہاں سے کہیں اور منتقل کرنے کا خیال بھی کسی کو نہ آئے گا۔ لیکن ملازمت تو ایک چکی ہے۔ چکی میں دلنے کی کیا حیثیت ہے۔ کہ چاہے تو پسے اور چاہے تو نہ پسے۔ عرض معروض تو کی ہے۔ دیکھئے۔ کیا حشر ہو۔ آپ جانتے ہیں۔ میں عمر بھر جنبہ داری سے دور رہا ہوں۔ محض خدمت گذاری اور خدا پر اعتماد رہا ہے۔ کون ہے جو اپنی مصلحتیں چھوڑ کر میری بہبودی کا بیڑا اٹھائے۔"

پطرس کے خطوں میں مزاحیہ عنصر نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"میں کاک ٹیل کا یوں منتظر رہتا ہوں۔ جیسے کوئی اپریشن کا منتظر ہو۔ کہ تکلیف بھی ہوگی لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ جس دن کاک ٹیل پارٹی ہو۔ میری شام غارت ہو جاتی ہے دو گھنٹے مسکرا مسکرا کر کلّے اکڑ جاتے ہیں۔"

منظر کشی کے میدان میں بھی پطرس کا مقام منفرد تھا۔ ملاحظہ ہو :

حکیم یوسف حسن کو ایک خط میں لکھتے ہیں" جون کو میرا پہلا امتحان ہے۔ ادھر موسم اس قدر خوشگوار ہو رہا ہے کہ دریا کے کنارے اس جھیل کے پاس جہاں بائرن کے تخیل کو پرواز ہوئی تھی۔ کسی پھول سے لدے ہوئے سبزہ زار میں گھنے اور بلند درختوں کے درمیان زندہ رہنے کو دل چاہتا ہے۔"

اور اب منیزہ فیض کے نام ایک خط سے اقتباس دیکھئے :

"یہاں خزاں کا موسم سب سے دلکش ہوتا ہے۔ اس موسم میں درختوں کے پتے پیلے، زرد

اور پھر تانبے کی طرح سُرخ ہو جاتے ہیں جنگلوں میں جیسے آگ سی لگ گئی ہو۔ جہاں کہیں درخت اُگے ہوتے ہیں۔ وہ جگہ بس انگریز کا کارخانہ معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اس نے پیارے پیارے رنگوں میں کپڑے رنگ کر سوکھنے کے لئے پھیلا دیئے ہوں۔ بڑی سڑک کے دونوں طرف دور دور تک قدرتی مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ سڑک پر گاڑی چلانے میں بڑا لطف آتا ہے۔ اور جی چاہتا ہے گھنٹوں ان گھنے جنگلوں میں بیٹھ کر تالابوں اور جھیلوں میں پڑے ہوئے کئی رنگ کے درختوں کے عکس کا نظارہ کیا جائے۔

اور اب ایک اور خط کی چند سطریں ملاحظہ فرمائیے:

"لاہور شہر . . . . کیا اس کے باغوں میں اب بھی سفیدے کے اونچے اونچے درخت خوشبو سے لدے کھڑے ہیں؟ کیا اب بھی راوی مغلوں کی یاد میں سسکتا رہتا ہے۔ کیا امرلوں کی گہری اور تاریک سبزی اب بھی عنابی بادلوں کے ساتھ آتی ہے اور برسات میں رلاتی ہے؟

. . . . میں چند دن کے لئے یہاں (جنیوا) کام کے بہانے سے آگیا ہوں۔ مضافات میں تنگ کنارگلیاں ہیں۔ انگور کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی دن بھر کوہ بلانک کی برف پوش چوٹی بلور کی سی دھوپ میں چمکتی رہتی ہے۔ دن ڈھلتے ہی فضا میں اور جھیل پر ایک پُراسرار نیلاہٹ چھا جاتی ہے۔ یہاں روح کو وسعت نصیب ہوتی ہے اور کئی پیچ و تاب تحلیل ہو جاتے ہیں"

اور اب میکسیکو سے لکھے ہوئے ایک خط کا حوالہ دیکھئے:

. . . . میکسیکو کو خلاف توقع دلکش اور رنگین پایا۔ اور کانفرنس کی وجہ سے مصروفیت اس قدر رہی کہ اپنی دور افتادگی پر آہ بھرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ تاہم گیتار بجانے والے کی تان کبھی رات کی خاموشی میں تیرتی ہوئی دل کے پاس سے گزر جاتی ہے یا ہسپانوی وضع کے مکانوں کی رومانی کھڑکیوں اور محرابوں اور سرو کے درختوں پر ہمارے وطن کی سی

شوخ دُھوپ چمکتی ہے اور ٹھنڈے ٹھنڈے گھاس پر لیٹ جاتے ہیں یا کونوں میں چھپ کر بلاتے ہیں تو لاہور والوں کا والہانہ پن یاد آتا ہے ۔‘‘

ادب اور ادیب کے کردار پر بحث کرتے ہوئے ایک خط میں عبدالقدیر رشک سے یوں مخاطب ہوتے ہیں :

آج سے چند سال پہلے آپ کا اردو ادب فرسودہ اور تقلیدی عناصر سے بری طرح الجھا ہوا تھا جس میں زندگی کے خدوخال نمایاں تھے، نہ ان صلاحیتوں کی ترجمانی جو تخیل کی آغوش میں نہیں، واقعات کی دنیا میں پرورش پاتی ہیں۔ ان میں کئی اشعار نشترِ پنہاں ہوں گے اور کئی مصرعے حرکتِ دل، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس میں خیالات کے نشیب و فراز، زندگی کی لغزش و استقامت اور انسانی منزل کی امید افزا کرنیں نہیں پھوٹتیں ۔

جوں جوں زندگی کے تقاضے بدلتے گئے ۔ ہمارے ہاں کے اکثر ادیبوں نے راہِ گریز چھوڑ کر زندگی کو اپنایا۔ انہوں نے نرم و نازک زبان کے ذریعے ملکی ادب کو آرٹ کی نئی قدروں سے دوچار کر دیا ۔

اب رُومانیت کا دور گزر چکا ہے ۔ اب اردو ادب زندگی کے تلخ حقائق اور شعوری محرکات کا ادراک رکھتا ہے ۔ وہ انسانی عظمت اور انسانی کارناموں کے اظہار سے مملو ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں صحت مند ادب جب تک زندہ رہے گا ۔ اس کا اہم ترین موضوع انسان ہی ہو گا ۔

سماجی زندگی میں ادیب کی حیثیت سنگِ میل کی سی ہوتی ہے ۔ معاشرہ کی سربلندی اور انسانی بہبود کے لئے افکار و تاثرات کو دوسرے افراد کی نسبت انسانی جذبات میں زیادہ آلہ کار ہونا چاہیئے ۔ دورِ حاضر کے جن ادیبوں نے اردو ادب میں زندگی کو اپنایا ہے ۔ ملک کے دانش ور اور عوام ان کی خدمات سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے ۔‘‘

ہاجرہ مسرور کے نام ایک خط میں وہ یوں رقمطراز ہیں :

دل میں بکھر جائے۔ وہ اپنی مقصود انتظار کو مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ وہ بارش کے اس پار آ جائے جہاں ان کا دل اور ان کی آنکھیں اپنی محبوبہ کے لئے خواہشوں اور آرزؤں کی پاکیزگیاں لئے اس کی راہ تک رہی ہیں۔ وہ اپنی محبوبہ کو ایک بار پھر اُس پار بلاتے ہیں، پیشتر اس کے کہ وہ اپنے ساز کو توڑ دیں اور اپنی تمام آرزؤں کو ایک دردانگیز چیخ کی صورت میں اپنے سینے سے نکال پھینکیں (۱)

---

(۱) "مینہ برس رہا ہے" ادیطرس کہکشاں اپریل ۱۹۲۵ء

پطرس بحیثیت شاعر

پطرس نے اردو میں بھی شعر کہے اور فارسی میں بھی کہا بہت کچھ۔ مگر شاعری کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ کہا اور ضائع کردیا۔ بعض شعری کارنامے صرف تفریح کا سامان بنے اور بس ایسا معلوم ہوتا ہے۔ مرحوم اُردو سے زیادہ اچھے فارسی شعر کہتے تھے۔

پطرس اپنی غزلوں میں محبوب سے مکمل سپردگی کا اظہار کرتے ہیں اور اسے باور کراتے ہیں کہ رات کی مستی اور دن کا خمار اسی کے دم قدم سے ہے اور اسی کی بدولت شاعر کی رگ رگ میں زہر احمر موجزن ہے۔ شاعر کے جذبات پر محبوب کو اتنی زبردست گرفت ہے کہ وہ جب چاہے اس کی آنکھوں کو خشک کردے اور جب چاہے انہیں نمناک بنا دے۔ شاعر کے نزدیک محبوب کا جسم چمن بھی ہے اور بہار بھی اور اسی کی زلف سے ہر آرزو معطر ہے۔ آخر میں وہ سپردگی کی آخری حدوں کو چھونے لگتے ہیں۔

ترا ہی حسن ہے فطرت کا آخری شاہکار
کہ جو ادا ہے وہ تیری ادا سے کمتر ہے

پطرس کے ہاں رومانیت کے گہرے شعور کے ساتھ ساتھ زندگی کے مسائل سے آگہی کی جھلک بھی ملتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

تجھی سے دل کا تلاطم ہے اور جگر کا قرار
اسی قرار و تلاطم سے زندگی بھی ہے
مگر ہیں اور بھی طوفان اس زمانے میں
کہ جن میں عشق کی نا ذِشکستنی بھی ہے

وہ کہتے ہیں کہ شبِ وصال کے مخملیں اندھیرے میں محبوب کی تلاش میں فردا کی روشنی بھی مضمر ہے۔ اصل کلام ملاحظہ ہو:

یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے مجھ کو
ترا ہی در میری آوارگی کا محور ہے
تجھی سے رات کی مستی تجھی سے دن کا خمار
تجھی سے میری رگ و پے میں زہرا حمر ہے
تجھی کو میں نے دیا اختیار گریہ پر
یہ چشم خشک اگر ہے یہ چشم اگر تر ہے
ترا ہی جسم چمن ہے ترا ہی جسم بہار
تری ہی زلف سے ہر آرزو معطر ہے
ترا ہی حسن ہے فطرت کا آخری شاہکار
کہ جو ادا ہے وہ تیری ادا سے کمتر ہے

یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے لیکن
مرے بیان میں اک لرزش خفی بھی ہے
تو میرے دعوئے الفت کی آن پر مت جا
کہ اس میں ایک ندامت دبی دبی بھی ہے
وفا طلب ہے ترا عشق اور مرے دل میں
تری لگن کے سوا اور بے کلی بھی ہے
تجھی سے دل کا تلاطم ہے اور نگہ کا قرار
اسی قرار و تلاطم سے زندگی بھی ہے

مگر ہیں اور بھی طوفان اس زمانے میں
کہ جن میں عشق کی ناؤ شکستنی بھی ہے
مری نگاہ کے ایسے بھی ہوں گے چند انداز
کہ تو کہے کہ یہ محرم ہے اجنبی بھی ہے
شبِ وصال کے اس مخملیں اندھیرے میں
مری تلاش میں فردا کی روشنی بھی ہے
مجھے تو آکے ملی وقت کے دوراہے پر
کہ صبحِ زیست بھی ہے موت کی گھڑی بھی ہے

نظم "میکدے میں" کے حوالے سے پطرس اپنی محبوب کو میکدے تک جانے کی دعوت دیتے ہیں تاکہ وہاں بیٹھ کر دل کی بات، جو وہ مدت سے اپنے دل میں چھپائے بیٹھے ہیں، بیان کر سکیں وہاں وہ خم کے سائے میں بیٹھ کر ایسی سرگوشیاں کرنا چاہتے ہیں کہ محبوب کے لب ان کی ہر بات کو نبات کر دیں۔ اسی عمل میں بے ثبات دنیا، اگر مزید بے ثبات ہوتی ہے تو اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ فریبِ مے سے دنیا کی بے ثباتی کو مزید بے ثبات بنادیں۔ پھر تان یہاں پر ٹوٹے کہ :

اگر منارۂ کسریٰ پہ دن نکل آئے
تو چشم وا نہ کریں اور دن کو رات کریں

اصل غزل ملاحظہ ہو :

جو تو کہے تو کسی میکدے میں چل بیٹھیں
جو دل کی بات ہے دل میں وہ دل کی بات کریں
میں خم کے سائے میں سرگوشیاں کروں ایسی
کہ تیرے لب مری ہر بات کو نبات کریں

جو بے ثبات ہے دُنیا تو بے ثبات سہی
فریبِ مے سے اسے اور بے ثبات کریں
اگر منارۂ کسریٰ پہ دن نکل آئے
تو چشم وا نہ کریں اور دن کو رات کریں

پطرس فارسی غزل بھی بڑی خوبصورت کہا کرتے تھے۔ غزل "نقش گم گشتگی" میں اپنے محبوب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب سے تو میرے لئے آرام جان کا باعث بن گیا ہے تب سے میرا سکون اور چین کھو گیا ہے۔ اور جب سے تیرا ذکر میری زبان پر آیا ہے، میری زبان کھو گئی ہے یعنی، سوائے تیرے ذکر کے اور میری زبان سے کچھ ادا ہی نہیں ہوتا۔

آگے چل کر محبوب سے کہتے ہیں: "تو ایک دیوانے کی جستجو اور نارسائی کا نہ پوچھ۔ میں ایک گھنٹی کی آواز پر چاروں طرف دوڑ رہا ہوں۔ مگر مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔"

شاعر کو یقین ہے کہ اس کے سجدوں کے نشان اہل نظر کے لئے آستانہ بن جائیں گے۔ لیکن اس نے عشق و محبت کی وارفتگی میں اتنے سجدے کئے ہیں کہ وہ آستان ہی گم ہو گیا ہے۔ اور اب اہل نظر کو خود آستان کی تلاش کرنا ہوگا۔

شاعر اس بات پر سخت افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ سوائے خاموشی کے اس کا کوئی ہمراز نہیں بن سکا ہے۔ اسے گلہ ہے کہ جب اس نے بات کہنے کے لئے لب کھولے تو اس کا رازداں ہی اس سے چھن گیا۔ یعنی ایک اس کی رازداری تھی۔ اس کے بولنے نے وہ رازداری ہی کھو دیا۔ غزل ملاحظہ ہو:

نقشِ گُم گشتگی

شدی تا باعثِ آرامِ جاں آرام جاں گُم شد
حدیثِ نام تو تا بر زباں آمد زباں گُم شد

مپرس از جستجو و نارسائی ہائے مجنونے
چو آوازِ جرس ہر سو دوید و ہر زماں گم شد
نشانِ سجدہ ام اہلِ نظر را آستاں باشد
کہ زیرِ سجدہ ہائے شوق من آں آستاں گم شد
مرا جز خامشی محرم نبود و وائے ناکامی
بہ اظہارِ سخن چوں لب کشودم راز داں گم شد
گر آوارگی آرد سوئے منزل بخاری را
کہ از گمراہئ خود ہم زراہ گمرہاں گم شد

ایک دوسری غزل میں پطرس اپنے محبوب سے یوں مخاطب ہوتے ہیں :

وہ داغ جو تو نے میرے دل پر لگایا ۔ وہ میری جان کی تصویر بن گیا ہے ۔ یعنی تیری محبت کا داغ مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے ۔ اور وہ آنکھیں جنہیں بولنے والے کا نام دیا جاتا ہے ۔ وہ میری راز دار بن گئی ہے ۔ یعنی تیری آنکھوں نے میری محبت کے راز کو جان لیا ہے ۔

دوسرے بند میں محبوب کو بتاتے ہیں ۔

میرا دل میری آغوش میں نہ سمایا اور باہر نکل گیا ۔ اسی طرح میرا خیال میرے دماغ سے نکل کر آسمان کی وسعتوں میں چلا گیا ۔ دل سینے کی تنگی کو برداشت نہ کر سکا ۔ اور خیال دماغ سے نکل گیا ۔ گویا میرا دل اور خیال تیری تلاش میں سرگرداں ہیں ۔

تیسرے بند کا متن کچھ یوں ہے :

اے پروردگار پوچھ ۔ پوچھ کیا پوچھتا ہے ۔ میں حسرت و اندوہ میں ڈوبی ہوئی نگاہ ہوں ۔ جو تو دیکھ رہا ہے ۔ اور یہی میرا حالِ زار ہے یعنی میرا دگرگوں حال ۔

چوتھے بند میں وہ محبوب کی توجہ یوں مبذول کراتے ہیں :

" تو نے چوری چوری میری طرف دیکھا ۔ بیباکانہ نہیں ۔ اور میرے دل کا حال جان لیا ۔ میری تمام

داستان محبت تونے پڑھ لی۔ اس طرح میری داستان الم نشرح ہوگئی۔

آخر میں وہ محبوب سے یوں تقاضہ کرتے ہیں :

تو مجھے جنوں کا پیالہ بھر کر دے۔ کیونکہ وحشت کا خیال پیچھے رہ گیا۔ اور وہ قافلہ کی گرد بن گیا۔ وہ اس شعر میں وحشت اور دیوانگی کا جام بھر بھر کر پینا چاہتے ہیں تاکہ عالم دیوانگی میں منزل شوق تک جا پہنچیں اور وہ مقصود کو حاصل کرلیں، غزل کا اصل متن ملاحظہ ہو :

ہم آں داغے کہ ہر دل از تو دارم حسرز جانم شد
ہم آں چشمے کہ نامنہ ش سخن گو رازدارم شد
وے بود و در آغوشم نگنجید و جہانم شد
خیالے داشتم از سرگذشت داستانم شد
بپرس اے دادر محشر کہ چہ پرسی چہ می پرسی
نگاہ حسرت آلایم کہ مے بینی بیانم شد
نگہ دزدیدہ افگندی بدل چوں رازجاں دارم
نظر کردی بہ بیباکی دفصل داستانم شد
دگر تدریج جنوں در رہ کہ ہم در منزل اول
خیال وحشتم واماند گرد کاروانم شد (۱)

اب پطرس کی رباعیات کی آزاد ترجمانی ملاحظہ ہو :

"اللہ کرے، ترا حسن روز بروز ترقی کرے۔ اس میں اضافہ ہو۔ اور میں ترے حسن بے مثال کا دیدار کرسکوں۔ اور خدا کرے کہ میری عمر بھی دراز ہو۔ تاکہ میں تری تمنا کرتا رہوں اور تمہاری محبت کا دم بھرتا رہوں۔ مجھ معصوم بے گناہ کو غصّہ کی نگاہ سے نہ دیکھ۔ اگر میں بے موقع وصل بوسہ کی التجا کر بیٹھوں۔

(۱) غزل از پطرس مطبوعہ ہزار داستان ستمبر ۱۹۲۲ء

تری ایک مسکراہٹ اور تری ایک ذرا سی التفات بھری نگاہ سے میری کہاں تسلی ہوتی ہے۔ میرے تو لبوں پر ایسی ایسی خواہشات کے لشکر ہیں۔ (یعنی بے شمار آرزوئیں ہیں)۔ شراب کا وہ قطرہ جو تری مستانہ چال سے ٹھوکر کھا کر جام سے زمین پر گرا۔ اسے ہوا نے مجھ پیاسے کے مرقد پر لا گرایا۔ یعنی زندگی میں جو ہماری آرزو پوری نہ ہوسکی۔ تو مرنے کے بعد شراب کے قطرے نے ہماری پیاس بجھائی۔"

"فرمودۂ پطرس" کے عنوان سے اصل اشعار ملاحظہ ہوں:

اے حسن تو زیادہ تماشہ کنم ترا
عمرم دراز بادِ تمنّا کنم ترا
برہم نظر مکن من ناکردہ کار را
گر التجائے بوسۂ بے جا کنم ترا

بہ تبسم چہ تسلّی بہ نگاہے چہ قرار
لشکر آرزوئے از لبم انگیختہ
بر سرِ خاک من تشنہ لبے ریختہ باد
قطرۂ مے کہ تو از لغزشِ پا ریختہ

پطرس نشریات کے میدان میں

۱۹۳۴ء میں آل انڈیا ریڈیو کا قیام عمل میں آچکا تھا محکمہ کے ڈائریکٹر مسٹر لائینل فیلڈن تھے۔ وہ خود ایک ماہر اہل قلم ہونے کے ساتھ ساتھ نشریات کے رموز سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ انہیں ایک ایسے سربراہ کی تلاش تھی۔ جو ملک کے لئے نشریات کا موزوں لائحہ عمل مرتب کرکے ان کو مناسب طریق پر چلا سکنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ فیلڈن کی نظر پطرس پر پڑی۔ اور اس نے انہیں اپنا دست راست منتخب کرلیا۔ فیلڈن کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ پطرس انگریزی زبان وادب کی مہارت میں اس برصغیر میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ پطرس جب ریڈیو کے پہلے سلیکشن بورڈ میں حکومت پنجاب کی جانب سے مقرر ہو کر آئے تھے تو فیلڈن ان سے مل کر بحد خوش ہوا تھا۔ اور اس وقت سے اسی تاک میں لگا رہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح انہیں ریڈیو میں لے آئے۔ اسی اثنا میں ڈپٹی کنٹرولر کی اسامی کی منظوری آگئی۔ فیلڈن نے بخاری کو بذریعہ تار بلوالیا۔ اس موقع پر بخاری نے محکمہ تعلیم کو خیرباد کہا اور دہلی چلے گئے۔ مگر وہاں جاکر معلوم ہوا کہ حکومت نے فیلڈن کی تجویز کو مسترد کرکے کاوس جی بہرام جی کو ڈپٹی کنٹرولر بنا دیا تھا۔ بادلِ ناخواستہ وائسرائے کے کہنے پر بخاری کو ریڈیو سٹیشن ڈائریکٹر مقرر کیا گیا (۱) فیلڈن اس بات پر سخت نادم تھا۔ اور کچھ ہی عرصہ بعد وہ بخاری کو ہیڈ آفس میں ڈپٹی کنٹرولر مامور کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ پطرس بخاری جب اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے تو اس وقت ذوالفقار بخاری اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر بنا دیئے گئے تھے۔ چنانچہ حالت یہ تھی کہ ایک بھائی اسٹیشن ڈائریکٹر دوسرا بھائی اسسٹنٹ ڈائریکٹر فیلڈن دونوں کا دوست۔ پھر کیا تھا۔ دیوان سنگھ مفتون نے بی بی سی کے حروف کو نئے معنی پہنا دیئے

---

(۱) "سرگزشت" از سید ذوالفقار علی بخاری صفحہ ۲۲

اور آل انڈیا ریڈیو کو بخاری برادرز کارپوریشن (بی بی سی) کا خطاب دے دیا۔ اس نے یہ فقرہ ایسا چست کیا کران کے نام کے ساتھ بس چپک ہی گیا۔ (۱)

اپنی طباعی، غیر معمولی ذہانت اور مختلف علوم و فنون میں واقفیت رکھنے کے سبب پطرس کی متنوع شخصیت گوناگوں کمالات کی حامل تھی۔ چنانچہ آل انڈیا ریڈیو سٹیشن پر جب وہ اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے تو دلی کے علمی، ادبی مجالس میں ان کے چرچے ہونے لگے۔ نشری دنیا میں بڑے بخاری (پطرس)، اور چھوٹے بخاری (ذوالفقار علی بخاری) کا بڑا شہرہ تھا۔ کچھ عرصہ تک "بڑے بخاری" اسٹیشن ڈائریکٹر اور چھوٹے بخاری اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر رہے۔ لیکن پھر بڑے بخاری ڈپٹی کنٹرولر مقرر ہو گئے۔ اور چھوٹے بخاری اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ فیلڈن کنٹرولر رہے۔ مگر انہوں نے بڑے بخاری کو انکی ذہانت و قابلیت کے بھروسے پر محکمے کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔

بااختیار ہونے پر پطرس نے برصغیر میں نشریات کا جال بچھانا شروع کیا۔ نئے نئے اسٹیشن کھولے۔ ضروری قواعد منضبط کئے اور گوشے گوشے سے ہونہار شخصیتوں کو کھینچ کر کسی نہ کسی حیثیت سے محکمہ نشریات میں لا شامل کیا۔ عشرت رحمانی لکھتے ہیں کہ ان کے ایماء پر تعلیمی اور ادبی حلقوں سے متعدد نامور حضرات آکر مختلف اسٹیشنوں پر جمع ہو گئے۔ پروفیسر رشید احمد، ن م راشد، محمود نظامی، الطاف گوہر، اعجاز بٹالوی، سید انصار ناصری، رفیع پیرزادہ، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، فیروز نظامی اور عشرت رحمانی اور متعدد دیگر اصحاب ایسے تھے، جو بخاری صاحب کے عہد میں ان کے اشارے یا تحریک پر نشریات میں شامل ہوئے تھے۔ (۲)

ڈپٹی کنٹرولر ہونے کے زمانے میں پطرس، فیلڈن ہی کی نظر میں نہیں، بلکہ اعلیٰ انگریز حکام اور اقتدارِ اعلیٰ کی نگاہوں میں بڑی قدر و منزلت رکھتے تھے۔ ان کا ضابطہ تحریر و تقریر دونوں حیثیت سے ناقابل تسخیر تھا۔ جو تجویز یا تحریک ہوتی، معقول اور مدلل۔ جوابات کرتے پختہ اور مناسب۔ اسی لئے ان کی باتوں میں بڑا وزن ہوا کرتا تھا۔

---

(۱) سرگزشت از ذوالفقار علی شاہ بخاری صفحہ ۲۷

(۲) "ضابطہ بے ضابطہ" از عشرت رحمانی صفحہ ۱۴۲

ایک اعلیٰ افسر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے محکمے کے نظم و نسق کو اس طرح ترتیب دیا کہ ان کے ہر قول و فعل میں ہمیشہ خود اعتمادی، نکتہ رسی، دور اندیشی اور قطعیت ہوا کرتی تھی۔ کسی کے خلاف فیصلہ کی صورت میں بھی اس کی دل آزاری کا اظہار تک نہ ہوتا۔ وہ ضابطے کے ہر معاملہ میں معمولی بات کو خاص اہمیت دیئے بغیر نہ ٹالتے اور اہم بات کو عام انداز میں اس طرح طے کر ڈالتے، جیسے نہایت معمولی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بخاری کے علم و فضل اور حسن گفتار و کردار کی خوبی تھی جس نے آل انڈیا ریڈیو کے محکمہ کو ایسے طوفانی زمانے میں فرقہ وارانہ تفرقوں سے باز رکھا۔ وہ زمانہ کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین نبرد آزمائی کا تھا۔ مسلم لیگ کے پیش نظر مسلمانوں کا مفاد اور ان کی آزادی کا حصول تھا۔ کانگرس ہندو مفاد پر تلی ہوئی تھی۔ ریڈیو کے عملے میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سبھی فرقوں کے لوگ شامل تھے۔ سوائے چند ایک مقامات کے ہر اسٹیشن پر کارکنوں کے مابین اتحاد اور بھائی چارے کے رشتے قائم تھے۔ ہندو مہاسبھائی بار بار تفرقہ انداز کی کوشش کی خصوصاً اردو زبان مٹا کر ہندی رائج کرنے کی بڑی جدوجہد کی۔ مگر مہاسبھائی جوڑ توڑ کو بخاری صاحب کے تدبر و حکمت نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ اردو کا نام بدل گیا۔ ہندوستانی ہوا۔ مگر زبان کی سلاست اور روانی میں فرق نہ آنے دیا اور جب ایک وقت آیا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے "زبان" اور مسلمان دونوں کے گلے پر چھری چلائیں۔ تو انہوں نے صاف انکار کر کے اس عہدہ جلیلہ سے سبکدوشی اختیار کر لی۔

بخاری صاحب ضابطہ و قاعدہ کی سختی سے پابندی کرنے کے باوجود، ہر معاملہ کو باتوں باتوں میں حل کر دیتے تھے۔ مشکل سے مشکل مسئلہ کو نہایت خندہ پیشانی سے بآسانی حل کر نا ان کے ضابطہ کا خاصہ تھا وہ اپنے تمام ماتحت اہلکاروں سے ایک اعلیٰ افسر سے زیادہ ایک ناصح مشفق کا سلوک اختیار کرتے۔ ہر شخص کی ذہنی صلاحیت اور قابلیت کو بخوبی پرکھ لیتے۔ اور اس کے ساتھ اسی انداز سے ہم کلام ہوتے۔ شگفتہ بیانی ان کا خاص کمال تھا۔ اور ہر شخص کا دل موہ لیتا اور بڑی سے بڑی شخصیت پر چھا جانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ان کے حلقہ احباب میں سیاسی لیڈر، سرکاری افسر، پروفیسر، دانشور، ادیب

سبھی شامل تھے۔ یہ سب لوگ ان کی لیاقت اور حسنِ گفتار کے معترف تھے۔ احباب میں سے اکثر انکے پاس سفارش لے کر بھی آیا کرتے تھے۔ مگر وہ تمام معاملات میں وہی فیصلہ کرتے جو حق و دیانت کے مطابق ہوتا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ جس کے خلاف فیصلہ ہوتا، وہ بھی مطمئن ہونے پر مجبور ہوتا۔

بخاری صاحب کا برتاؤ اپنے ماتحت افسروں کے ساتھ ہی مشفقانہ نہیں تھا۔ بلکہ تمام درجوں کے ملازمین کے ساتھ بھی پسندیدہ تھا۔ ہر اہلکار ان کے حسن سلوک اور اخلاق حمیدہ کا گرویدہ اور معترف تھا۔ ماتحت عملہ میں جو ادیب، شاعر اور ان کے دوست احباب شامل تھے ان کے ساتھ وہ دفتر میں نہایت سخت گیر ڈائریکٹر جنرل نظر آتے تھے۔ لیکن نجی صحبتوں میں اسی انداز کی بے تکلفی برتتے۔ جس حیثیت کے مراسم ہوتے۔ ضابطہ کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار اسٹوڈیو کے محافظ نے ان کو حسب ضابطہ بغیر پرمٹ دروازے کے اندر داخل ہونے سے روک دیا۔ ملازم کی اس حرکت پر وہ برہم نہیں ہوئے۔ بلکہ اس کی فرض شناسی اور مستعدی کی تعریف کی اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کی۔

پطرس جب کسی شہر میں ریڈیو سٹیشن کے معائنہ کو جاتے تو سٹاف کی جانب سے دی جانے والی دعوت کے تمام اخراجات خود برداشت کرتے۔ وہ اپنے ملنے والوں سے صاف طور پر کہہ دیتے آپ لوگوں کا مقصد مجھ سے ملاقات کرنا ہے۔ مجھے آپ سب کے ساتھ مل بیٹھنے سے مسرت ہو گی۔ لیکن آپ کو جو خوشی ہوگی۔ اس کی قیمت آپ کی جیبوں سے ادا کر کے بار خاطر نہیں بننا چاہتا۔ ان دعوتوں میں تمام اہل کاروں سے نہایت، بے تکلفی اور خندہ پیشانی سے ملتے اور ان کی پوری پوری مدد کرتے۔

برصغیر کے تمام بڑے بڑے شہروں میں نشری مرکزوں کا قیام اور اس کا استحکام انہی کے ہاتھوں انجام پایا۔ ہندوستان میں نشریات کی توسیع کا جو کام ۱۹۳۷ء اور اس کے بعد عمل میں آیا۔ اس کا خاکہ بخاری نے کئی سال قبل مکمل کر لیا تھا۔ یعنی نشریات کا ملک گیر جال بچھانے کا دستور العمل انہوں نے تیار کر دیا تھا۔ جس پر بعد میں عمل درآمد ہوا۔ اس عالی دماغ، اہل علم و بصیرت ہستی نے نشریاتی دنیا میں اپنے تدبر و حکمت اور فنکارانہ صلاحیتوں کے غیر معمولی جوہر دکھلائے۔

بخاری سات برس تک ریڈیو سے منسلک رہے۔ کنٹرولر جنرل ہونے کی حیثیت سے ان کو بے شمار کانفرنسوں میں شرکت کا موقعہ ملا۔ ساتھ ہی دوسری جنگ عظیم کے دوران دولتِ برطانیہ کا پروپیگنڈا کرنے کے لئے جو سپریم کمانڈ بنی تھی۔ اس میں بھی ان کی ضرورت محسوس کی گئی چنانچہ حکومت وقتاً فوقتاً ان کے مفید مشوروں سے فائدہ اٹھاتی رہی اس سلسلے میں انہیں حکومتِ ہند کی طرف سے افغانستان بھی بھیجا گیا۔ چنانچہ انہوں نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ (۱)

پروفیسر بی۔ اے۔ ہاشمی راوی ہیں کہ ریڈیو کی ملازمت کے دوران جب وہ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے ایک دو سال انتہائی بدمزہ گزرے۔ لیکن انہوں نے کبھی اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ اور حالات کو سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ اور آخر کار تمام دشواریوں پر فتح پالی۔ ایک واقعہ سُنیئے بی اے۔ ہاشمی کے الفاظ میں۔

" میں لاہور سے دلی گیا ہوا تھا۔ صرف ایک آدھ روز کے لئے۔ بغیر اطلاع بخاری صاحب سے ملنے ان کے دفتر پہنچا۔ گاڑی سے اُترا ہی تھا کہ محکمے کے فرنگی افسر اعلیٰ سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ان کی اور میری بے تکلف ملاقات تھی۔ وہ سمجھے کہ میں ان سے ملنے آیا ہوں۔ نہایت گرمجوشی سے ملے۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد جب انہوں نے اپنے کمرے میں چلنے کو کہا۔ تو میں نے بتایا کہ میرا مقصود اس وقت بخاری صاحب ہیں۔ یہ بات اسے چُبھی۔ لیکن خلش کو دُور کرنے کے لئے اس نے سلسلۂ گفتگو دراز کر دیا۔ اچھے خاصے پندرہ منٹ کھڑے کھڑے اور باتیں کرتے گزر گئے۔ تو بولا۔ چلو، میں تمہیں بخاری کے کمرے میں پہنچا دوں۔ بخاری صاحب کے کمرے میں پہنچے، میرے اچانک پہنچنے پر متعجب اور خوش ہوئے۔ فوراً غالب کا مصرع پڑھا۔

آئے خدا کرے یہاں، پر نہ کرے خدا کہ یوں

مجھے بخاری صاحب کے کمرے میں پہنچا کر فرنگی رخصت ہو گیا۔ ہم دونوں باتوں میں مشغول ہو گئے۔ لیکن چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ وہ صاحب پھر آگئے۔ کاروباری بات کی مجھ سے معافی

---

(۱) ضابطہ، بے ضابطہ: عشرت رحمانی، نقوش پطرس نمبر صفحہ ۹۵

مانگتے ہوئے بخاری صاحب سے مخاطب ہوئے کہ ایک ضروری دورے پر وہ اگلے ہفتہ خود مدراس جائیں گے۔ اور اس لئے بخاری صاحب کے پیشِ نظر جو بھی پروگرام ہو، وہ منسوخ کر دیا جائے۔ چونکہ بخاری صاحب کو دفتر میں موجود رہنا ہوگا۔ نہایت خوش ہو کر بخاری صاحب بولے۔ آپ ضرور مدراس جائیے۔ شکر کا مقام ہے کہ میں گرمی کے زمانے میں ریل میں بیٹھ کر ریگستان کی خاک پھانکنے سے بچ گیا۔ دلی کا خوشگوار موسم، دفتر کا دلپسند کمرہ، میں نہایت خوشی سے دفتر میں رہوں گا۔

وہ فرنگی افسرِ اعلیٰ، بخاری صاحب کو میرے آگے ہلکا بنانے آیا تھا۔ لیکن خود سبک ہو کر واپس ہو گیا۔ مگر خراشیدہ راہست قصدِ خراش۔ دس منٹ کے بعد پھر آیا۔ اور بولا۔ بخاری صاحب مجھے کاغذات دیکھتے ہوئے خیال آیا کہ اگلے ہفتے ایک دو معاملات کے لئے میری دلی میں موجودگی ضروری ہوگی۔ اس لئے اب تم ہی دورے پر مدراس چلے جاؤ۔ بخاری صاحب اچھل پڑے۔ تالیاں بجانے لگے۔ اللہ وہ ناریل کے لمبے لمبے جھومتے ہوئے درخت، وہ نیلا سمندر، وہ خاموش فضائیں، وہ فلاں اور فلاں سے ملاقات، یقین جانو۔ صعوبتِ سفر دو لمحے بھی یاد نہ رہے گی۔ اس شخص نے بھونچکا ہو کر بخاری صاحب کا منہ دیکھا اور کچھ کہے بغیر کلغی گرائے کمرے سے چلا گیا۔

"میں اس ڈرامے کا تماشائی تھا، بخاری صاحب بولے، بھائی۔ اگر یہ سال بھر اور رہ گیا تو یہاں سے پاگل خانے جائے گا۔" (۱)

پطرس کی ریڈیو سے وابستگی کے دوران بے شمار ایسے واقعات ہیں جو اپنے اندر دلچسپی کا بے پناہ سامان سموئے ہوئے ہیں۔ ان کے چند دوستوں کے تاثرات، ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ آل انڈیا ریڈیو کا محکمہ دہلی میں قائم ہوا۔ تو اس کے عملے کا تقرر ایک بورڈ نے کیا۔ جس میں مسٹر فیلڈن ڈائریکٹر جنرل، بخاری، ڈاکٹر کریم حیدر لودھی اور کچھ اور لوگ بھی تھے جن میں رشید احمد صدیقی خود بھی شامل تھے۔ صدر فیلڈن تھے۔ اس بورڈ کی سفارش پر ذوالفقار بخاری، آغا اشرف، مجاز اور بعض دوسرے لوگوں کا مختلف اسامیوں پر تقرر ہوا تھا۔

(۱) میرا نام بخاری ہے نقوش پطرس نمبر صفحہ ۴۰

قاعدہ کے مطابق امیدواروں سے ہر ممبر نے اپنے اپنے مضامین کے بارے میں تھوڑی بہت گفتگو کی۔ ڈاکٹر کریم حیدر پبلک سروس کمیشن کی طرف سے آئے تھے۔ ان کے سوالات کبھی کبھی مبہم ہوتے اور مشکل بھی۔ اس پر ان کا بھاری بھرکم جثّہ۔ ایسی ہی آواز، کڑے تیور، امیدوار پر ہیبت سی طاری ہو جاتی۔

ڈاکٹر حیدر کے بعد رشید احمد صدیقی کی نشست تھی۔ لنچ کے بعد بورڈ کے ممبر اکٹھے ہوئے تو انٹرویو کا کام شروع کرنے سے پہلے فیلڈن نے ان امیدواروں پر تبادلہ خیال کیا جو بورڈ کے سامنے آچکے تھے۔ گفتگو ختم ہونے پر آئی تو فیلڈن نے ڈاکٹر حیدر کو مخاطب کر کے کہا۔ ڈاکٹر حیدر دیکھو اگر تم نے آئندہ امیدواروں کو دھمکانے کا ارادہ کیا تو میں بے تامل تم کو گولی مار دوں گا۔

ڈاکٹر حیدر نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بڑے زور کا قہقہہ لگایا، دونوں پاؤں اٹھا کر کرسی پہ پیچھے کی طرف لیٹ سے گئے۔ پھر مصافحہ کے لئے فیلڈن کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ڈاکٹر حیدر کے داد دینے کا یہی انداز تھا۔ اتنے میں بخاری نے آواز دی۔ صدیقی صاحب! ادھر آ بیٹھو۔ فیلڈن کے نشانے پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اب فیلڈن کا وہی حال تھا جو پروفیسر حیدر کا تھا۔

شوکت تھانوی جب ریڈیو سے وابستہ تھے تو ایک بار انہوں نے بخاری سے اپنی کتاب پر مقدمہ لکھوانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مگر انہوں نے یہ لکھ کر مسودہ لوٹا دیا کہ "اب جب کہ آپ کو ریڈیو میں ایک منصب حاصل ہو چکا ہے۔ عافیت کا تقاضا یہی ہے کہ آپ مجھ سے مقدمہ نہ لکھوائیں۔ اور میں مقدمہ نہ لکھوں"۔ اب بخاری محکمہ کے اعلیٰ افسر تھے۔ اور شوکت تھانوی، ایک کارکن۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ایک بار بخاری لکھنؤ کے اسٹیشن کے معائنہ کے لئے آئے۔ تو وہ اہتمام کے ساتھ مجھ سے ملے۔ کچھ دن کے تجربے کے بعد معلوم ہوا کہ بخاری کے جس سلوک کو میں اپنے ساتھ خصوصیت سمجھتا تھا وہ ہر ایک کے لئے عام تھا۔ اور ان کا طریقہ ہی یہ تھا کہ سرکاری اور محکمہ جاتی کام کے وقت وہ نہایت بھاری بھرکم قسم کے لئے دیئے افسر بنے رہتے تھے۔ اور کام ختم ہوتے ہی نجی صحبتوں میں ان سب کے لئے

بے تکلف دوست بن جایا کرتے تھے۔ جن پر ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کا رعب قائم رہ چکا تھا لطیفے سنا رہے ہیں۔ نئے لطیفے سنانے کی فرمائش کر رہے ہیں۔ بات سے بات پیدا کر رہے ہیں۔ ہنس رہے ہیں اور ہنسا رہے ہیں۔ ایک دن اسی قسم کی نجی صحبت میں ہنس بول رہے تھے کہ ایک بھولی بسری یاد کر کے ٹہلتے ہوئے میرے قریب آکر سرگوشی کے انداز میں بولے:

" مجھ کو بری کرنے کے بعد آپ نے وہ مقدمہ کس پر دائر کیا ؟"

کسی پر نہیں۔ وہ مجموعہ بغیر مقدمہ کے چھپ گیا، کہنے لگے۔ " میری یہ سزا بحال رہی کہ میں اسے پڑھ نہ سکوں "

پھر پوچھنے لگے " آخر لوگ مقدمہ کھولتے ہی کیوں ہیں۔ مجھے تو یہ حرکت کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی کسی کی انگلی پکڑ کر ٹہل رہا ہو۔ بلکہ انگلی پکڑ کر میلہ دیکھنے گیا ہو "

میں نے اعتراف کیا۔ جی ہاں۔ میں اس حماقت کو سمجھ چکا ہوں۔ اور اب اس مقدمہ بازی کے چکر میں نہ پھنسوں گا،

بڑی سنجیدگی سے بولے۔ " اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت دے "

صوفی تبسم لکھتے ہیں۔ کہ ریڈیو کے زمانے میں ان کے ایک دوست سے کوئی کوتاہی ہوئی۔ انہوں نے بڑی سختی سے مواخذہ کیا۔ دوست ان کی غیر معمولی خفگی پر بگڑ گئے۔ اور استعفیٰ لکھ کر ان کے حوالے کیا انہوں نے افسرانہ وقار کے ساتھ لے لیا، اور کہا، بہت اچھا آپ تشریف لے جائیے۔

دفتر کے بعد بخاری صاحب اس دوست کے مکان پر بیٹھے۔ دیگر احباب کے ساتھ معافی مانگ رہے تھے۔

اور اب محمد طفیل کی زبانی ایک واقعہ سنیے۔ " دلی میں جب عصمت چغتائی پطرس سے ملیں۔ تو یہ ان دنوں آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل تھے۔ عہدے کا بھی رعب تھا اور پھر یہ تھے بھی پطرس۔ مقابل میں چغتائی تھیں۔ ایک ادیبوں کا امام۔ ایک ادیبنوں کی امام۔

پطرس نے تابڑ توڑ کئی خوبصورت فقرے کہہ ڈالے۔ عصمت چپ خاموشی سے سنتی رہیں۔

جب پطرس ذرا تھمے تو بولیں: "آپ کے یہ سارے فقرے میں پہلے بھی سن چکی ہوں۔ کوئی نیا فقرہ کہیئے۔"

جناب طفیل لکھتے ہیں: معلوم نہیں۔ یہ دو بڑے ذہنوں کی زور آزمائی تھی۔ چھیڑ چھاڑ یا افسانہ (۱)

اور آخر میں ایک اور روایت بھی سن لیجیے۔ پطرس جب آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے انہوں نے ایک گٹار خریدا۔ اور اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر دلّی کی نواحی بستیوں میں گھر گھر جا کر یہ صدا دی۔

"بابا اللہ کے نام پر کچھ ملے گا؟"

"ہم دونوں بھائی کل رات سے بھوکے ہیں"

"بھلا کر بھلا ہوگا"

"اپنے بچوں کا صدقہ ہمیں کھانا کھلا دو"

یاد رہے ان کا دوسرا ساتھی سابق گورنر جنرل پاکستان غلام محمد تھا (۲)

پطرس کے یہ مشغلے عجیب ضرور تھے۔ مگر ان میں زندگی سے پیار اور اس سے لطف اندوز ہونے ہی کے تو سارے رنگ روپ تھے۔ مرحوم کو معلوم تھا۔ زندگی بڑی نعمت ہے۔ اسے ہر رنگ میں بسر کرو۔ وہ عمر بھر اس اصول پر سختی سے کاربند رہے۔

---

(۱) "جناب پطرس" از محمد طفیل، نقوش پطرس نمبر صفحہ ۱۲۰

(۲) " " " " " ۱۲۲

پطرس اقوامِ متحدہ میں

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے کچھ ہی پہلے پروفیسر بخاری کو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کا عہدہ سونپا گیا۔ اسی کالج سے وہ پاکستانی نمائندہ کی حیثیت سے لندن گئے جہاں انہوں نے ان مذاکرات میں حصہ لیا۔ جو انڈیا آفس لائبریری کی املاک کی تقسیم سے متعلق تھا۔

۱۹۴۸ء میں میکسیکو میں ریڈیو کے بارے میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی بخاری مرحوم نے اس میں پاکستان کی نمائندگی کی اور ایک نہایت مفید رپورٹ لکھی۔ ۱۹۴۹ء میں اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی کمیٹی میں بھی آپ نے پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی۔ ۱۹۵۰ء میں جب لیاقت علی خان نے وزیر اعظم پاکستان کی حیثیت سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا دورہ کیا تو ہر شخص نے بخاری کا لوہا مانا۔ بخاری اس تاریخی دورے میں ہر جگہ ان کے ہمراہ رہے۔ اس تمام عرصہ میں انہوں نے روزانہ اکیس گھنٹے نہایت جانفشانی سے کام کر کے ملک کی عزت میں اضافہ کیا۔ ان خدمات کو اتنا سراہا گیا۔ کہ اقوام متحدہ میں انہیں پاکستان کا مستقل مندوب نامزد کر دیا گیا۔ اس عہدے پر وہ ۱۹۵۴ء تک فائز رہے۔ ان پر دل کا پہلا دورہ ۱۹ اگست ۱۹۵۲ء کو پڑا۔ اس دورہ کی وجہ سے وہ کمزور ہو گئے۔ لیکن انہوں نے اقوام متحدہ کے انڈر سیکرٹری کا کام پوری تندہی سے سرانجام دیا۔

اس عالمی ادارے میں ان کی شخصیت کا یہ پہلو سامنے آیا کہ وہ ایک باوقار اور سلجھے ہوئے سیاستدان بھی ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے اس ادارے کی مجلس شوریٰ کی صدارت بھی کی اور خوب نام پیدا کیا۔

سلامتی کونسل کی مجالس میں بخاری کی شگفتہ اور متوازن تقریریں اتنی پسند کی جاتی تھیں کہ

دنیا گوش برآواز ہو کر سنتی تھی۔ ان کی باتوں میں گُلوں کی خوشبو تھی۔ ہر نغمہ حسن تمنائے گوش تھا۔ تقریروں کے بعض حصے تو شیکسپیئر اور دوسرے بلند پایہ انگریزی ادیبوں کے حوالوں اور لطیف طنز و مزاح سے مزین ہونے کی بدولت ادب پارے ہوتے تھے۔ پاکستان کے مسائل کو جس خوش اسلوبی اور سلیقے سے انہوں نے پیش کیا۔ وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ تونیسیہ کے بارے میں انہوں نے ایک سچے اور مخلص مسلمان کا کردار جس انداز میں پیش کیا اسے تمام دنیا کے مسلمان انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

۱۹۵۵ء میں بخاری کی صلاحیتوں کے پیش نظر اقوام متحدہ کے سیکرٹری مسٹر ڈاگ ہیمر شولڈ کی خواہش پر انہیں اقوام متحدہ کے شعبۂ اطلاعات کا ڈپٹی سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ وہ پہلے ایشیائی تھے۔ جو اس عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ اس عہدے سے اپریل ۱۹۵۹ء کے آخر میں سبکدوش ہونے والے تھے۔ انہوں نے کولمبیا یونیورسٹی میں ادبیات انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کی پیشکش قبول بھی کر لی تھی۔ مگر ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء میں ان کی حرکت قلب بند ہو گئی اور اس طرح افسانۂ حیات سمٹ گیا

پروفیسر بخاری کی ذات میں مشرق و مغرب کی خوبیاں جمع تھیں۔ یہی ان کی شخصیت کا سب سے بڑا کمال تھا۔ مسٹر ڈاگ ہیمر شولڈ سیکرٹری جنرل مجلس اقوام متحدہ نے ان کی رحلت پر جو اعلامیہ شائع کیا اس میں ان کی خدمات اور صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

" پروفیسر بخاری مشرق و مغرب کی میراث کے مالک تھے۔ یہی وہ نمایاں خصوصیت ہے جس کی بدولت ہم بین الاقوامی مسائل حل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وسعتِ فکر و نظر کے بغیر یہ مشکل کام نہیں چل سکتا۔ نئی دنیا میں وحدت پیدا کرنے کے لئے لازم ہے کہ بزرگ میراث اور روایات پر کامل نظر ہو۔ جدید نسل کا فرض ہے کہ وہ اپنے اندر وہی فضائل و مکارم پیدا کرے جو بخاری کی شخصیت میں آشکار تھے "

بخاری کی نغمہ گوئی، بیدار مغزی اور شگفتہ بیانی اقوام عالم کے سربرآوردہ نمائندگان میں

ضرب المثل ہو چکی ہے۔ اور انہوں نے اپنے حسنِ گفتار اور دانش و حکمت کا دنیا بھر سے لوہا منوا لیا۔ لیکن اس بین الاقوامی شہرت اور عزّ و افتخار کے مالک ہونے کے باوجود ان کا دل وطن اور احبابِ وطن کے لئے ہمیشہ بے چین رہا۔

غلام رسول مہر درست لکھتے ہیں کہ قومی یا بین الاقوامی سیاست سے انہیں کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ تاہم جب پاکستان کی طرف سے انہیں اقوامِ متحدہ میں نمائندگی کا منصب سونپا گیا تو وہ تھوڑی ہی مدت میں نہ صرف اسلامی اور مشرقی ممالک کے نمائندوں کی صف میں ممتاز ترین حیثیت اختیار کر گئے۔ بلکہ بین الاقوامی دائرے کے بھی ہر شخص کے دل میں ان کے لئے انتہائی احترام پیدا ہو گیا۔ یہ بخاری ہی تھے جنہوں نے ایک طرف بہترین قومی اور اسلامی مصلحتوں کی نگہداشت کا حق ادا کیا اور دوسری طرف اہلِ وطن کے سامنے بار بار وہ مسلک واشگاف طریق پر پیش کیا جو بین الاقوامی سیاست میں کامیابی اور فائز المرامی کا واحد ذریعہ ہے۔ اسی بالغ نظری' اسی حقیقت شناسی' اور اسی واقعیت' دوستی اور فکر و نظر میں اسی توازن کی بنا پر انہیں انجمنِ اقوامِ متحدہ میں وہ مقام حاصل ہوا۔ جو غالباً مشرقی ممالک کے کسی فرد کو میسر نہ آسکا۔ انجمن اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو ان کی رائے اور صوابدید پر بھرپور اعتماد تھا۔

محمد طفیل درست فرماتے ہیں کہ پاکستان کی بقا کے لئے مرحوم کے کارنامے انمٹ ہیں۔ دُنیا بھر میں ان کی حب الوطنی کا شہرہ رہا۔ اور یو۔این۔او کے در و دیوار مرحوم کی پاکستان دوستی کی قسمیں کھاتے ہیں۔ وہ پاکستان پر ایک کتاب ایڈٹ کر رہے تھے جس کا نام تھا (A Study of Pakistan) اسے کئی ابواب میں تقسیم کیا گیا جو بھی جس موضوع پر لکھ سکتا تھا۔ اسے اس کام کی تکمیل کے لئے پکارا۔ ادبی رجحانات پر خود لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر یہ کام بھی تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ (۱)

اقوام متحدہ میں پطرس کی معرکۃ الآرا تقریروں کا ضمناً ذکر پہلی سطروں میں آچکا ہے

(۱) جناب پطرس، محمد طفیل، نقوش پطرس نمبر صفحہ ۱۲۳

اب ہم یہاں ان کی تقریروں کی ایک جھلک پیش کرتے ہیں۔

۴ اپریل ۱۹۵۲ء کو بطرس نے پاکستان کے مستقل نمائندے کی حیثیت سے سلامتی کونسل میں تونیسیہ کے مسئلے پر تقریر کے دوران فرمایا:

کیا فرانس کی حکومت اس بات پر خوش ہوگی کہ اہلِ تونیسیہ اپنی تکالیف کے ازالہ کے لئے تحریکات چلاتے رہیں؟ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے غیر ذمہ دارانہ طریقے اختیار کرنے لگیں؟ کیا کوئی اور تنظیم ایسی موجود ہے۔ جو اقوام متحدہ سے بہتر کام انجام دے سکتی ہے؟ فرانس والے انہیں کہاں بھجوانا چاہتے ہیں؟

اگر تونیسیہ جیسی صورتِ حال پر اقوام متحدہ میں بحث نہیں ہو سکتی تو اقوام متحدہ کس مرض کی دوا ہے۔ اگر مظلوم و مقہور اقوام اپنی آواز یہاں نہیں پہنچا سکتیں تو پھر ہم لوگ یہاں کس غرض سے جمع ہیں؟

ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے آگ لگی ہوئی دیکھی ہے۔ یہ آگ ہم نے خود نہیں لگائی ہم نے شعلے بھڑکتے دیکھے ہیں۔ اور ہم آگ بجھانے والے محکمے کے پاس یہ کہنے کے لئے آئے ہیں کہ ذرا اس آگ کو دیکھیے اور اسے بجھائیے۔ اب آگ بجھانے والے کہتے ہیں کہ ہم تو اس طرف نگاہ بھی نہیں کریں گے۔ یہ بڑی عجیب صورت حال ہے۔ اس کے باوجود ہم اس سوال سے دلچسپی لیتے رہیں گے کیونکہ یہ مسئلہ ان مظلوم انسانوں کا ہے، جنہیں ہم اپنے بھائی سمجھتے ہیں۔ ہم اہل تونیسیہ کی حالت زار کو فراموش نہیں کر سکتے۔ ہم ان سے کہہ دینا چاہتے ہیں کہ حفاظتی کونسل اپنی صوابدید کے مطابق خواہ کوئی فیصلہ کرے یا کرنا چاہے۔ ہم اپنے دلوں میں چراغ روشن رکھیں گے۔ اور جو کچھ ہم سے ہو سکے گا کر گزرنے میں قطعاً دریغ نہ کریں گے۔

اور اب ہم بطرس کی دوسری تقریر کے اقتباس پیش کرتے ہیں۔ یہ تقریر انہوں نے تونیسیہ کا مسئلہ ایجنڈے پر لانے کے لئے ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء کو کی تھی۔ وہ اس وقت کونسل کے صدر بھی تھے۔

۔۔۔اتے ہیں کہ اگر کسی معاملے کے متعلق آزادانہ بحث سے اقوام متحدہ پر بُرا اثر پڑتا ہے تو پھر کچھ میں

نہیں آتا کہ آج کی دُنیا میں اقوام متحدہ کا اور کون سا بڑا وظیفہ رہ جاتا ہے۔

...... تونِسیہ میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ اول وہاں کے اصل باشندے اور دوسرے فرانسیسی فرانسیسیوں نے ہزاروں فوجیں وہاں اتاردیں۔ ان کے ساتھ ٹینک ہیں۔ توپیں ہیں۔ اور ہر قسم کے آلاتِ داسلحہ ہیں جس حد تک مجھے علم ہے۔ اہل تونسیہ کے پاس نہ کوئی اسلحہ خانہ ہے اور نہ کوئی حربی کارگاہ۔ لہٰذا اگر ہمارے الفاظ کسی کو مشتعل کر سکتے ہیں تو وہ صرف فرانسیسی ہیں۔ وہی موثر طریق پر مشتعل ہوں گے۔ اہل تونسیہ میں کیونکر اشتعال پیدا ہو سکتا ہے؟

...... سر گلیڈون جیب نے انگریزی زبان پر قابلِ رشک دسترس کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو کچھوے اور مجھے خرگوش سے تشبیہ دی۔ اس طرح مجھے جلد بازی کا ملزم گردانا۔ موصوف نے بتایا کہ برطانوی دولت مشترکہ میں بھانت بھانت کے سیاسی جانوروں کی گنجائش ہے۔ یہ تو غالباً درست ہے۔ لیکن اگر برطانوی دولت مشترکہ میں شترمرغ بھی موجود ہیں تو وہ میرے ملک میں نہیں پائے جاتے۔

...... فرانس کے ارباب بست و کشاد غالباً یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ انہوں نے ہمارے ساتھ ـــــ ان گیارہ قوموں کے ساتھ جو اس مسئلہ کو ملاحظہ کونسل میں لائیں ـــــ شطرنج کی بازی لگا رکھی ہے اور انہیں جلد سے جلد چال چل جانی چاہیئے۔ ورنہ کوئی خوفناک واقعہ رونما ہو جائے گا۔ ہم ان سے شطرنج نہیں کھیل رہے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم شکایت بڑی متحدہ کے سامنے بہت پہلے پیش کر دیتے ...... اہل فرانس ہم سے جنگ نہیں کر رہے۔ اور ہماری ان سے کوئی لڑائی نہیں۔ وہ تاریخ سے جنگ کر رہے ہیں۔ اور اگر وہ واقعات کی رفتار سے سر توڑ لینا پسند کریں گے تو برابر ناکام رہیں گے ہم فرانس کے مفاد کی مخالفت نہیں کر رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود فرانس کے ارباب بست و کشاد اپنے وطن کے مفاد کی مخالفت میں سرگرم عمل ہیں۔ وہ ان مٹھی بھر فرانسیسی آباد کاروں کے مفاد کی حفاظت میں مصروف ہیں جنہوں نے تونسیہ میں حد درجہ وسیع مراعات حاصل کر رکھی ہیں۔ اور پیرس کے سیاسی حلقے ان کی حمایت میں حد درجہ پر زور اور گرم جوش ہیں فرانس میں بھی آزاد خیال لوگوں کا خاصا بڑا

گروہ ہے۔ جس نے تونیسیہ کی موجودہ صورت حال کو ذلّت خیز قرار دیا۔ فرانس آزاد خیالی کی عظیم الشان روایات کا حامل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تونیسیہ کے ڈیڑھ لاکھ فرانسیسی آبادکار ان روایات کی درخشانی کو مدہم کر سکیں گے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے ان روایات کو پس پشت ڈالنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن ہمیشہ کے لئے ایسا نہیں کر سکتے۔

اور اب ہم اس بیان کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جو انہوں نے سلامتی کونسل کے سامنے ۱۴ اپریل ۱۹۵۲ء کو دیا۔ مسئلہ وہی تیونس والا۔

اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں پطرس اور ان کے وفد کے مقاصد یہ تھے۔

۱۔ سلامتی کونسل کے اثر و رسوخ کو وسیلہ بنا کر تونیسیوں کو بے عزتیوں اور پریشانیوں سے بچایا جائے ان کے اموال و نفوس کو تباہی سے محفوظ رکھا جائے۔ ان کے شہری حقوق کو ضائع نہ ہونے دیا جائے اور یہ سب مصیبتیں ان پر اس قصور کی پاداش میں نازل کی جا رہی ہیں کہ انہیں اپنے ملک اور اپنی قومی آزادی سے محبت ہے۔ اس مقصد کو ہمارے نزدیک سب پر تقدم حاصل ہے۔

۲۔ سلامتی کونسل کے اثر و رسوخ کو وسیلہ بنا کر اس تعطل کو ختم کیا جائے۔ جو فرانسیسیوں اور تونیسیوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو تیزی سے برباد کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ دوستانہ تعلقات قائم رہنے چاہئیں۔

۳۔ افریقہ اور ایشیا میں عوام کے جذبات یہ منظر دیکھ کر برانگیختہ ہو رہے ہیں کہ ایک کمزور، بے یار و مددگار اور شریف قوم اور ایک حد درجہ قوی یورپی طاقت کے درمیان خونریز جد و جہد جاری ہے۔ وہ یورپی طاقت بدرجہا زیادہ قوی ہے۔ اور دوسری قوم پر قبضہ و تصرف کے لئے آج کوئی اخلاقی وجہ پیش نہیں کی جا سکتی۔ باشندگان افریقہ و ایشیا کے جذبات کی برانگیختگی کو جلد سے جلد روکنا ضروری ہے۔ (۱)

ذیل میں بخاری مرحوم کی اس افتتاحی تقریر کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، جو انہوں نے پاکستان کے مستقل نمائندے کی حیثیت سے برنارڈ کالج نیویارک کی ماڈل جنرل اسمبلی کے چھٹیویں

---

(۱) مسئلہ تیونس پر تقریر سلامتی کونسل ۱۴ اپریل ۱۹۵۲ء نقوش پطرس نمبر صفحہ ۳۱۹

اجلاس میں ۷، اپریل ۱۹۵۲ء کو فرمائی۔

مغربی یورپی اقوام اور مشرقی اقوام کے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے بخاری نے سامعین کی توجہ اس نکتے کی جانب مبذول کرائی کہ ان اقوام میں پہلا اختلاف دُنیا کے نسلی مسائل کی جذباتی تعبیر سے متعلق اُٹھتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ دنیا کی اکثر و بیشتر اقوام ماضی میں شدید نسلی امتیازات کا شکار رہی ہیں۔ اور بعض اب بھی اسی امتیاز کا تختۂ مشق بنی ہوئی ہیں ...... میں اس نسلی امتیاز کا ذکر کر رہا ہوں جو وسیع بین الاقوامی پیمانے پر کیا جا سکتا ہے اور جو نہ صرف وقار انسانی کے منافی ہے بلکہ امن عامہ کے لئے بھی خطرے کا باعث ہے۔

دوسرا مسئلہ جس پر اقوام کے اس گروہ کے احساسات بڑے شدید ہیں۔ اسے عام طور پہ استعمار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ گروہ دنیا کی نصف سے زائد آبادی کی نمائندگی کرتا ہے۔ دُنیا کے نصف سے زیادہ نفوس ایشیا میں رہتے ہیں۔ اور اگر انسان ہونے کی کیفیت وحیثیت کے اعتبار سے نہیں تو کم از کم مقدار و عدد کے اعتبار سے وہ بہت وزن رکھتے ہیں۔ ان کے احساسات بھاری تعداد کی بدولت عالمی حیثیت میں بڑی اہمیت و قوت رکھنے والا عامل بن جاتے ہیں۔ متعدد ممالک ایسے ہیں جو قریب تر ماضی میں استعماری اقتدار کا شکار ہوئے ہیں۔ استعمار میرے نزدیک دُہری لعنت ہے۔ یہ اس کے لئے بھی لعنت ہے جو حاکم و مقتدر بنتا ہے۔ اور اس کے لئے بھی جسے غلام و محکوم بنایا جاتا ہے۔ استعمار میں مقتدر وجود مادی فائدے تو اٹھاتا ہی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ساتھ ہی انسانی فطرت کو اس طرح توڑ مروڑ کر رکھ دیا جاتا ہے جس کے بعد انسانیت کا وقار خاک میں مل جاتا ہے۔ اور استعماذ وہ لوگ اس نوع میں شمار ہوتے۔ کے قابل نہیں رہتے جس کے افراد ہونے کے وہ دعوے رکھتے ہیں۔ استعمار محکوموں اور حاکموں دونوں کی نفسیات برباد کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ ہر استعماری حکمران، بشرطیکہ وہ روشن دماغ ہو، محسوس کرے گا کہ یہ کیفیت اسے شعوری طور پہ فائدہ پہنچانے کی بجائے لاشعوری طور پہ بے حد نقصان پہنچا رہی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہ ممالک دُنیا کے غریب ترین باشندوں کے نمائندے ہیں، اب کیفیت

یہ ہے کہ یہ غریب ممالک بین الاقوامی تبدیلئ احوال کے باعث اچانک اپنے آپ کو عالمی سٹیج پر بیٹھا ہوا دیکھ رہے ہیں ۔ جہاں اُن سے کہا جاتا ہے کہ عالمی برادری کے فرد کی حیثیت سے دوسروں کے برابر ذمہ داریاں اٹھائیں ۔ یہ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ ایسی ذمہ داریاں قبول کریں لیکن انہیں جو وسائل میسر ہیں ۔ ان کے ساتھ وہ عالمی کوائف سے عہدہ برآ ہونے میں اس اہلیت اور صلاحیت کا ثبوت نہیں دے سکتے جو ان کے بعض ترقی یافتہ رفیق ملک پیش کر سکتے ہیں ۔ یہ ممالک کہتے ہیں کہ اس صورت حال کی اصلاح کر کے دنیا سے شدید اقتصادی نامساوات دور کی جائے ۔

بین الاقوامی معاشرے میں اگر برادری کا کوئی رکن پسماندہ ہے ، ناخواندہ ہے بیماریوں کا مارا ہُوا ہے ، افلاس و قحط میں مبتلا ہے اور مدد کے لئے پکارتا ہے ۔ تو کم و بیش یہی تصوّر کر لیا جاتا ہے کہ اسے بیرا امداد خیرات کے طور پر دی جاسے ۔ یہ وہی جذبہ ہے جو اب سے ایک یا دو صدی پہلے ٹیکس دینے والے دولت مندوں میں کارفرما تھا ۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ قوم کے باقی افراد کو اپنی دولت کی زکواۃ دے رہے ہیں ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کی اقتصادی ناہمواری دور کرنے کا بہترین حل کیا ہے ؟ میرے نزدیک سب سے پہلے بین الاقوامی معاشرے کو ان ممالک کی امداد انصاف کے تقاضوں کے پیش نظر کرنی چاہیئے ۔ اس کے بعد ممالک کو ایک دور سے نکال کر دوسرے دور میں داخل کرنا لازم ہے ۔ آج کی دنیا نے صنعتی ترقی اور مشینی پیداوار کے لحاظ سے جو شکل اختیار کر رکھی ہے اسکی طرف صحیح رہنمائی کی جائے ۔ (۱)

---

(۱) ماڈل جنرل اسمبلی از پطرس نقوش پطرس نمبر صفحہ ۶۲۷

حرفِ آخر

پطرس بخاری کی بھرپور شخصیت کی ایک جھلک آپ نے دیکھ لی۔ ان کے فن کے بارے میں بھی آپ نے اپنی رائے قائم کرلی ہوگی۔ مرحوم ایک باکمال یگانۂ روزگار ہستی تھے۔ وہ ایک ممتاز اور متبحر عالم تھے جو مشرق و مغرب کے حیات پرور ادب کے نغموں سے سرشار تھے۔ ایک جوش آفریں استاد کی حیثیت سے ان کا پایہ بہت بلند تھا انہوں نے جس چیز کو چھوا اس کی ہئیت بدل دی اور جس سے ملے اس کی رفتار تیز تر کردی۔ تحقیق و تجسس کا شوق انہیں نئی نئی گزرگاہوں میں لے گیا تازہ بتازہ قوت حاصل کرنے کے لئے انہوں نے کئی رودبار عبور کئے۔ گوناگوں اور بوقلموں پھولوں سے دامن بھر کے لٹایا۔ زمینوں کو سیراب کیا۔ دریاؤں میں طغیانی پیدا کی۔ یہاں تک کہ وہ کناروں سے اچھل پڑے۔ بزم ادب یا تمثیلات کی مجالس میں وہ جانِ محفل تھے۔ وہ اپنے ہم ذوق لوگوں کی صحبت میں تکلف کا نقاب اتار کر کھل کھیلتے تھے۔ خود ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے تھے۔ ان کی بے پناہ شگفتگی کا نظارہ ناقابلِ فراموش تجربہ تھا۔ وہ عہد آفریں تھے ان کے ہمعصر اپنی ترقی پسندی، روشن خیالی، ذہنی ارتقا اور بے پایاں حرکی قوت کے لئے بخاری ہی کے مرہون منت تھے۔

بخاری کی رحلت سے وہ اسلوب تحریر رخصت ہوگیا ہے جس میں مختلف زبانوں کی جوہری لطافتیں اس طرح جھلکتی تھیں جیسے شفق کی نوجیں۔ ان کے ساتھ ادیبانہ خطابت، خطیبانہ ادبیت، متین ظرافت اور ظریفانہ متانت یوں رخصت ہوگئیں کہ یہ شعور ہوتا ہے، جیسے اب کبھی لوٹ کے نہ آئیں گی

بخاری کی ہر تخلیق ایک کارنامہ ہے۔ ہر مضمون پڑھ کر یہ گماں گزرتا ہے کہ بخاری اس سے بہتر مضمون نہ لکھ سکیں گے۔ ہر بار یہ گمان غلط ثابت ہوتا ہے۔ ہر دوسرا مضمون پہلے سے بڑھ کر خوبصورت ہوتا ہے۔

محمد طفیل نے چند مشاہیر کے تاثرات، ایک ایک سطر میں قلمبند کئے ہیں۔ ان سب کو ملا کر دیکھا جائے تو پطرس کی شخصیت پوری تابانی کے ساتھ ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ملاحظہ ہوں چند آرار

"سیاست میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں۔ وہ احمد شاہ بخاری میں موجود تھیں" (ہمیر شولڈ)

"بخاری صاحب محفل سازی اور محفل آرائی میں فرد تھے" (البشیر احمد ہاشمی)

"پطرس نے اردو میں سب سے کم سرمایہ چھوڑا مگر کتنا اونچا مقام پایا" (رشید احمد صدیقی)

"احمد شاہ بخاری کی موت علم و ادب اور خلوص و محبت کی موت ہے" (عبدالمجید سالک)

"پطرس کی ڈرامہ پر بڑی نظر تھی۔ کسی ڈرامے میں خود کام کیا۔ تو اپنی ایکٹنگ کا بھی لوہا منوایا"

(امتیاز علی تاج)

"بخاری کی حیثیت صرف استاد کی نہ تھی بلکہ وہ طالب علموں کے مشفق رہنما اور دوست تھے۔

(صوفی تبسم)

"نہ جانے کیوں میں پطرس بھا گئے۔ اور ایک جان چھوڑ، ہزار جان سے ان پر عاشق ہو گئے"

(عصمت چغتائی)

ادب لطیف

تنزّل

مجھے نہیں معلوم میرا انجام کیا ہوگا؟ جس تیزروی سے میں تنزّل کی طرف جارہا ہوں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دل و دماغ کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ مجھے خود بھی اس بات کا یقین ہے۔ میں ہمیشہ سے اس کا قائل رہا ہوں۔ لیکن میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں بے بس ہوں۔ میں مجبور ہوں۔ میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتا۔ ایک زبردست کشش۔ ایک ہمہ گیر جاذبیّت مجھے ہلاکت اور پستی کی طرف کھینچے لئے جارہی ہے۔

آہ! بہت تھوڑے عرصہ کا ذکر ہے کہ میں اپنے آپ کو ایک نہایت عالی مقام پاتا تھا۔ میرا مطمح نظر اور میرا دائرۂ افق اس قدر وسیع تھا کہ اس پر نظر ڈالتے ہوئے میرا دماغ چکر کھاتا تھا۔ مجھے صرف عالی نگاہ لوگ دیکھ سکتے تھے۔ اور میں کوتاہ بینوں سے مامون تھا۔ اب میری یہ حالت ہے کہ کسی اور کو تو کیا۔ میں خود اپنے آپ کا مطالعہ نہیں کرسکتا۔

مجھے معلوم ہے کہ بہت عرصہ نہیں گزرنے پائے گا جب میری حیات فنا ہوجائے گی۔ شاید میرے حواس مجھے جواب دے جائیں۔ میں اپنے آپ کو زندہ کہتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مُردوں سے بدتر ہوں۔ کیونکہ جو شخص مرجاتا ہے وہ کہیں نہ کہیں ٹھکانے تو لگ جاتا ہے۔ اور میرا حال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ آرام و سکون میسّر

لئے ناممکنات میں سے ہیں۔ نہ مجھے اس وقت کوئی ناصح مفید ہو سکتا ہے، اور نہ میں خود ہی اپنی رہنمائی کر سکتا ہوں۔ چارہ گر کو مجھ پر رحم آ سکتا ہے۔ اسے میرے نزدیک آنے کی ہمت نہیں پڑ سکتی۔

زندگی میں یہ ایک ——— صرف ایک لغزش کا نتیجہ ہے۔

آپ نہیں سمجھے؟ خوب! بات یہ ہے کہ میں جامع مسجد کے مینار سے گر رہا ہوں

(مخزن اکتوبر ۱۹۲۱ء)

وارفتگیٔ جذبات

بھائی ..... تم سے کیا کہوں طبیعت روز بروز حساس ہوتی جاتی ہے۔ دل میں ایک بے نام سا رنج رہتا ہے جس کو تنہائی اور بھی بڑھا دیتی ہے۔ مختلف اسباب مل کر ایک عجیب بے دلی پیدا کر دیتے ہیں۔ میں فطرتاً ہوس ناک ہوں۔ ناکامیوں نے مجھے دل برداشتہ بنا دیا ہے۔ اس لئے بعض اوقات ایک پیالی کا ٹوٹ جانا زلزلے کی طرح مجھے برہم کر دیتا ہے۔ اسے شاعری نہ سمجھنا۔ یہ حقیقت ہے کہ گھنٹوں مطالعہ میں مشغول رہتا ہوں۔ پھر خیال آتا ہے کہ یہ سب بے فائدہ ہے۔ پہروں سوچتا رہتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ رات کو لیمپ بجھا دیتا ہوں کہ اب سو جاؤں اور پھر جلا دیتا ہوں کہ نیند نہیں آتی۔ آدھی رات کے وقت گھر کے سب لوگ دن بھر کی کلفت اور تکان کے بعد خوابِ راحت میں ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ میں اس وقت حیات کی ایک بیداری اور جذبات کی ایک بے قراری پاتا ہوں۔ جو مجھے سونے نہیں دیتی۔

کہیں دور چند غریب پٹھان مزدور رباب بجا رہے ہیں۔ اور پشتو کے کسی دردناک گیت کی فراق زدہ نوا، رباب کی سادہ موسیقی، رات کی تنہائی اور خاموشی، دل کے تاروں میں ایک دھیمے سے درد کا نغمہ چھیڑ دیتی ہے جس کو گھنٹوں تک بے حس و حرکت پڑا سنتا رہتا ہوں۔ مضطرب روح سرحدی کوہستانوں کے درشت عشق و حسن کی

داستان سن کر اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ بار بار یہی تصوّر آتا ہے کہ ایک جنگجو غیور اور تنومند افغان نے اپنی بندوق کو کندھے سے اتار کر پتھروں پر رکھ دیا ہے، اور ایک ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تصنّع سے مبرّا فقروں میں اپنے عشق کی کہانی کہہ رہا ہے۔ غیرت کی آغوشِ کوہ کی پروردہ حسینہ کے خوبصورت سڈول بازوؤں کو نسوانیت نے ڈھیلا کر دیا ہے اور اس کی معصوم نگاہوں میں ایک مجبو بیت آگئی ہے۔ لیکن ایک اس کے جوانی بھرے سینے کو غیرت نے ابھار دیا ہے۔ اور وہ اپنے چاہنے والے کو بزدلی کے بھوت کے خوف کے طعنے دے رہی ہے۔ رعبِ حسن میں تنی ہوئی اسے اجتناب کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ پھر غصّہ میں آ کر اس نے اپنی گھاس کی گٹھری اور درانتی کو سر پہ رکھ لیا ہے۔ اور ندی کے بیچ میں سے گزر کر اس پار چلی گئی ہے۔ رباب کے تاروں میں ایک اضطراب، ایک شکستگی سنائی دیتی ہے۔ غیرت مند افغان نے اپنی بندوق کو اٹھا کر مضبوط گرفت میں پکڑ لیا ہے اور ایک پتھر پر کھڑا اردگرد کی چوٹیوں کو، پتھریلے ٹیلوں کو بے رحم پہاڑیوں کو طیش کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خون ہے۔ اور آگ ہے۔ اس نے بندوق میں ایک کارتوس بھر لیا ہے اور اس بنجر اور ریتلے کوہستان میں اس کے گیت کی مہجور سُریں وادیوں میں گونج گونج کر موت کو تلاش کر رہی ہیں۔ ایک جنگجو کی موت کو، ایک فاتح کی موت کو۔ عشق اس میدان وکوہ میں آوارہ، سرگرداں پھر رہا ہے۔ اس جستجو میں کہ کہیں ایک بے رحم عورت کی خاطر اپنی جان مردانگی اور بہادری کے حوالے کر دے۔ غیبر کے ڈراؤنے اور بنجر پہاڑ محبت کی اس وارفتگی کو دیکھ رہے ہیں۔ اور موت کی طرح خاموش اور دہشت انگیز ہیں۔ اس موت کی طرح جو اتنی ظالم ہے کہ نہیں آتی۔ رباب کی موسیقی بے دردی سے دل کے ٹکڑے کر رہی ہے۔

مجھے اس وقت ایک عجیب دور افتادگی، ایک غربت، ایک بے کسی کا احساس ہوتا ہے گویا ایک درماندہ اور راہ گم کردہ مسافر ہوں، نظر کو سوئے افق کی ناشکستہ لکیر کے

اور کچھ معلوم نہیں ہوتا اور تکان نے منزل سے مایوس کر دیا ہے۔ گویا میں صحرا کی دہشت اور آسمان کی پہنائی میں ایک ذرہ ہوں اور ستاروں کی دور دراز دنیا تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں کیونکہ وہی سب سے نزدیک معلوم ہوتے ہیں۔ چاند کھجور کے درختوں کے ایک جھنڈ میں سے چمک رہا ہے۔ اور کائنات میں یا چاندنی ہے جو چپ چاپ خاموشی سے برس رہی ہے یا تاریک سائے ہیں جن میں رات نے اپنے پُراسرار اقتدار کی ہیبت کو چھپا رکھا ہے۔ فضا میں اس درد کے گیت نے ایک بے حد بے قراری پیدا کر دی ہے۔ میرے دل میں اس وقت ڈر نہیں ہوتا خوف نہیں کھاتا فقط ایک اضطراب ہوتا ہے ایک ناقابلِ بیان بے قراری ہوتی۔ اپنے آپ کو بستر پرسکون کی حالت میں مردہ کی طرح دیکھ کر دل غصے میں پیچ و تاب کھاتا ہے کہ میں بے بس کیوں ہوں۔ بس یہ بے بسی کا احساس جذبات میں ایک طلاطم پیدا کر دیتا ہے۔ اور تنہائی ایک محشرستانِ بیداری ایک ہنگامہ بن جاتی ہے۔

رفتہ رفتہ رباب کی موسیقی دھیمی ہو جاتی ہے اور گیت میں نے آہستہ آہستہ چاندنی میں تحلیل ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ رات کا طلسم جذبات کی سردی پرسکون کی چادر ڈال دیتا ہے۔ آنسو پلکوں پر سوکھ جاتے ہیں۔ اور آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ قدرت کے دل میں رحم آ جائے تو ہوا کے جھونکے تھپک تھپک کر سلا دیتے ہیں۔ نیند آ ہی جاتی ہے۔ مگر آہ! کس بیداری کے بعد!

(مخزن جولائی ۱۹۲۱ء)

مزاحیہ مضامین

اخبار میں ضرورت ہے

یہ ایک اشتہار ہے۔ لیکن چونکہ عام اشتہاروں سے بہت زیادہ طویل ہے اس لئے شروع ہی میں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوا ورنہ شاید آپ پہچاننے نہ پاتے۔

میں اشتہار دینے والا ایک روزانہ اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ چند دن سے ہمارا چھوٹا سا اشتہار اس مضمون کا اخباروں میں نکل رہا ہے کہ ہمیں مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ یہ غالباً آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا اس کے جواب میں کئی امیدوار ہمارے پاس پہنچے اور بعض کو تنخواہ وغیرہ چکانے کے بعد ملازم بھی رکھ لیا گیا ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ہفتے دو ہفتے سے زیادہ ٹھہرنے نہ پایا۔ آتے کے ساتھ ہی یہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ اشتہار کا مطلب وہ کچھ اور سمجھے تھے۔ ہمارا مطلب کچھ اور تھا۔ مختصر سے اشتہار میں سب باتیں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا مشکل تھا۔ جب رفتہ رفتہ ہمارا اصل مفہوم ان پر واضح ہوا یا ان کی غلط توقعات ہم پر روشن ہوئیں تو تعلقات کشیدہ ہوئے، تلخ اور بعض اوقات دست درازی تک نوبت پہونچی اس کے بعد یا تو وہ خود ہی ناشائستہ باتیں ہمارے منہ پر کہہ کر چائے والے کا بل ادا کئے بغیر چل دیئے یا ہم نے دھکے مار کر باہر نکال دیا۔ اور وہ باہر کھڑے نعرے لگایا کئے جس پر ہماری اہلیہ نے ہم کو احتیاطاً دوسرے دن دفتر جانے سے روک دیا اور اخبار بغیر لیڈر ہی کے شائع کرنا پڑا۔ چونکہ اس قسم کی غلط فہمیوں کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا ہے اس لئے ضروری

معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے مختصر اور مجمل اشتہار کے مفہوم کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں کہ ہمیں کس قسم کے آدمی کی تلاش ہے اس کے بعد جس کا دل چاہے ہماری طرف رجوع کرے جس کا دل نہ چاہے وہ بے شک کوئی پریس الاٹ کرا کے ہمارے مقابلے میں اپنا اخبار نکال لے۔

امیدوار کے لئے سب سے بڑھ کر ضروری یہ ہے کہ وہ کام چور نہ ہو، ایک نوجوان کو ہم نے شروع میں ترجمے کا کام دیا۔ چار دن کے بعد اس سے ایک نوٹ لکھنے کو کہا تو بپھر کر بولے کہ میں مترجم ہوں سب ایڈیٹر نہیں ہوں ایک دوسرے صاحب کو ترجمے کے لئے کہا تو بولے میں سب ایڈیٹر ہوں، مترجم نہیں ہوں ہم سمجھ گئے کہ یہ ناتجربہ کار لوگ مترجم اور سب ایڈیٹر کو دو الگ الگ آدمی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اخبار میں یہ قاعدہ نہیں، ہم سے بگڑنے لگے کہ آپ نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ دوسرے صاحب کہنے لگے آپ کے اشتہار میں عطف کا استعمال غلط ہے ایک تیسرے صاحب نے ہمارے ایمان اور ہمارے صرف و نحو دونوں پر فحش حملے کئے اس لئے ہم واضح کئے دیتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہم کو ہرگز ضرورت نہیں جو ایک سے دوسرا کام کرنے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں اور اس کے لئے صرف و نحو کی آڑ لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو ملازم ہوں گے انہیں تو وقتاً فوقتاً ساتھ کی دکان سے پان بھی لانے پڑیں گے۔ اور اگر انہیں بحث ہی کرنے کی عادت ہے تو ہم ابھی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سب ایڈیٹر کے معنی یہ ہیں۔ ایڈیٹر کا اسم مخفف، اخبار میں ایک عہدہ دار کا نام جو ایڈیٹر کو پان وغیرہ لا کر دیتا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہمارا اخبار زنانہ اخبار نہیں۔ لہٰذا کوئی خاتون ملازمت کی کوشش نہ فرمائیں پہلے خیال تھا کہ اشتہار میں اس بات کو صاف کر دیا جائے۔ اور لکھ دیا جائے کہ مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے جو مرد ہوں لیکن پھر خیال آیا کہ لوگ مرد کے معنی شاید جوانمرد سمجھیں۔ اور اہل قلم کی بجائے طرح طرح کے پہلوان نشینل گارڈ والے اور

مجاہد پٹھان ہمارے دفتر کا رخ کریں پھر یہ بھی خیال تھا کہ آخر عورتیں کیوں آئیں گی مردوں کی ایسی بھی کیا قلت ہے۔ لیکن ایک دن ایک خاتون آہی گئیں۔ پُرزے پر نام لکھ کر بھیجا ہمیں معلوم ہوتا کہ عورت ہے تو بلاتے ہی کیوں؟ لیکن آج کل کم بخت نام سے تو پتہ ہی نہیں چلتا۔ فاطمہ، زبیدہ، عائشہ کچھ ایسا نام ہوتا تو میں غسل خانے کے رستے باہر نکل جاتا لیکن وہاں تو ناز جہانجر دی، یا عندلیب گلستانی یا کچھ ایسا ہی فینسی نام تھا۔ آج کل لوگ نام بھی تو عجیب عجیب رکھ لیتے ہیں۔ غلام رسول، احمد دین، مولا داد ایسے لوگ تو ناپید ہی ہو گئے ہیں جسے دیکھئے نظامی، گنجوی اور سعدی شیرازی بنا پھرتا ہے۔ اب تو اس پر بھی شبہ ہونے لگا کہ حرارت نغزیزی، نزلہ کھانسی، شہاب مصری ادیبوں ہی کے نام نہ ہوں عورت مرد کی تمیز تو کوئی کیا کرے گا۔ بہرحال ہم نے اندر بلایا تو دیکھا کہ عورت ہے، دیکھا کے یہ معنی ہیں کہ ان کا برقعہ دیکھا اور حسن ظن سے کام لے کر اندازہ لگایا کہ اس کے اندر عورت ہے۔ ہم نے بصد ادب و احترام کہا کہ ہم خواتین کو ملازم نہیں رکھتے۔ انہوں نے وجہ پوچھی ہم نے کہا پیچیدگیاں اٹھنے لگیں آگے بولئے۔ ہم نے کہا پیدا ہوتی ہیں۔ بھڑک کر بولیں کہ آپ بھی تو عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ کیونکہ اس امر کا ہماری سوانح عمری میں کہیں ذکر نہیں اس لئے ہم تائید تردید کچھ نہ کر سکے میری ولادت کو انہوں نے اپنا تکیہ کلام بنا لیا، بہتیرا سمجھایا کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور بہرحال میری ولادت کو آپکی ملازمت سے کیا تعلق؟ اور یہ تو آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں اگر ہمارے پروپرائٹر سے کہیں تو وہ آپ کی اور میری ہم دونوں کی ولادت کے متعلق وہ نظریئے بیان کریں کہ آپ ہکا بکا رہ جائیں خدا خدا کر کے پیچھا چھوٹا۔

ہمارے اخبار میں پروپرائٹر کا احترام سب سے مقدّم ہے۔ وہ شہر کے ایک معزز ڈپو ہولڈر ہیں اخبار انہوں نے محض خدمتِ خلق اور رفاہ عام کے لئے جاری کیا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ پبلک ان کی شخصیت اور مشاغل سے ہر وقت باخبر رہے۔ چنانچہ ان کے

پوتے کا ختنہ، ان کے ماموں کا انتقال، ان کے صاحبزادے کی میٹرکولیشن میں حیرت انگیز کامیابی (حیرت انگیز ان معنوں میں کہ پہلے ہی ریلے میں کامیاب ہو گئے) ایسے واقعات سے پبلک کو مطلع کرنا ہر سب ایڈیٹر کا فرض ہو گا۔ نیز ہر اس پریس کانفرنس میں جہاں خورد و نوش کا انتظام بھی ہو ہمارے پروپرائٹر مع اپنے دو چھوٹے بچوں کے جن میں سے لڑکے کی عمر سات سال اور لڑکی کی پانچ سال ہے شریک ہوں گے اور بچے فوٹو میں بھی شامل ہوں گے اور اس پر کسی سب ایڈیٹر کو زیرِ لب فقرے کسنے کی اجازت نہ ہو گی یہ بچے بہت ہی ہونہار ہیں۔ اور حالاتِ حاضرہ میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں۔ کشمیر کے متعلق پریس کانفرنس ہوئی تو چھوٹی بچی ہندوستانیوں کی ریشہ دوانیوں کا حال سن کر اتنے زور سے روئی کہ خود مسٹر ابراہیم اسے گود میں لئے لئے پھرے تو کہیں اس کی طبیعت سنبھلی۔

ہمارے اخبار کا نام "آسمان" ہے پیشانی پر یہ مصرعہ مندرج ہے کہ آسمان بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے۔ اس فقرے کو ہٹانے کی کوئی بھی سب ایڈیٹر کوشش نہ فرمائیں۔ کیونکہ یہ خود ہمارے پروپرائٹر صاحب کا انتخاب ہے۔ ہم نے شروع شروع میں ان سے پوچھا بھی تھا کہ صاحب اس مصرعے کا اخبار سے کیا تعلق ہے۔ کہنے لگے اخبار کا نام آسمان ہے اور اس مصرعے میں بھی آسمان آتا ہے ہم نے کہا بجا لیکن خاص اس مصرعے میں کیا خوبی ہے کہنے لگے علامہ اقبال کا مصرعہ ہے اور علامہ اقبال سے بڑھ کر شاعر اور کون ہے اس پر ہم چپ ہو گئے پیشانی پر اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار بھی لکھا ہے۔ یہ میرا تجویز کیا ہوا ہے۔ اسے بھی بدلنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ عمر بھر کی عادت ہے ہم نے جہاں جہاں ایڈیٹری کی اپنے اخبار کی پیشانی پر یہ ضرور لکھا۔

بعض امیدوار ایسے بھی آتے ہیں کہ آتے کے ساتھ ہی ہمیں سے سوالات پوچھنے لگتے ہیں۔ ایک سوال بار بار دہراتے ہیں کہ آپ کے اخبار کی پالیسی کیا ہے۔ جیسے کوئی پوچھے کہ آپ کی ذات کیا ہے۔ ہماری پالیسی میں چند باتیں تو مستقل طور پر شامل ہیں مثلاً ہم حربوں

حامی ہیں اور امریکہ سے ہرگز نہیں ڈرتے، چنانچہ ایک دن تو ہم نے پریذیڈنٹ ٹرومین کے نام اپنے اخبار میں ایک کھلی چٹھی بھی شائع کر دی لیکن عام طور پر ہم پالیسی میں جمود کے قائل ہیں۔ اسی لئے سب ایڈیٹر کو مسلسل ہم سے ہدایات لینی پڑیں گی۔ ہفتہ رواں میں ہماری پالیسی یہ ہے کہ پنڈی گھیب کے ہیڈ ماسٹر کو موسم سرما سے پہلے یا ترقی دلوائی جائے یا ان کا تبادلہ لاہور کرا دیا جائے۔ (ان کے لڑکے کی شادی ہمارے پروپرائیٹر کی لڑکی سے طے پا چکی ہے اور خیال ہے کہ موسم سرما میں شادی کر دی جائے گی)

انشا کے متعلق ہمارا خاص طرز عمل ہے اور ہر سب ایڈیٹر اور مترجم کو اس کی مشق بہم پہنچانی پڑے گی۔ مثلاً پاکستان بنا نہیں۔ معرض وجود میں آیا ہے۔ ہوائی جہاز اُڑتا نہیں محوِ پرواز ہوتا ہے۔ مترجموں کو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑے گا۔ ایک مترجم نے لکھا کہ کل مال روڈ پر دو موٹروں کی ٹکر ہوئی اور تین آدمی مر گئے۔ حالانکہ انہیں کہنا چاہیئے تھا کہ دو موٹروں کے تصادم کا حادثہ رونما ہوا جس کے نتیجے کے طور پر چند اشخاص جن کی تعداد تین بتائی جاتی ہے مہلک طور پر مجروح ہوئے۔

لاہور کارپوریشن نے اعلان کیا کہ فلاں تاریخ سے ہر پالتو کُتے کے گلے میں پیتل کی ایک ٹکیہ لٹکانی ضروری ہے جس پر کمیٹی کا نمبر لکھا ہوگا۔ ایک مترجم نے یہ ترجمہ یوں کیا کہ ہر کُتے کے گلے میں بلا ہونا چاہیئے' حالانکہ کارپوریشن کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ ایک جانور کے گلے میں ایک دوسرا جانور لٹکا دیا جائے۔

سینما کے فری پاس سب ایڈیٹر کے مشاہرے میں شامل نہیں۔ یہ پاس ایڈیٹر کے نام آتے ہیں اور وہی ان کو استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ فی الحال یہ پروپرائیٹر اور ان کے اہل خانہ کے کام آتے ہیں لیکن عنقریب اس بارے میں سینما والوں سے ایک نیا سمجھوتہ ہونے والا ہے اگر کوئی سب ایڈیٹر اپنی تحریر کے زور سے کسی سینما والے سے پاس حاصل کرے تو وہ اس کا اپنا حق ہے لیکن اس بارے میں ایڈیٹر کے ساتھ

کوئی مفاہمت کر لی جائے تو بہتر ہوگا، علی ہٰذا جو اشیاء ریویو کے لئے آتی ہیں مثلاً بالوں کا تیل، عطریات، صابن، ہاضم دوائیاں وغیرہ وغیرہ ان کے بارے میں بھی ایڈیٹر سے تصفیہ کر لینا ہر سب ایڈیٹر کا اخلاقی فرض ہوگا۔

ممکن ہے ان شرائط کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص بھی ہمارے ہاں ملازمت کرنے کو تیار نہ ہو اس کا امکان ضرور موجود ہے لیکن ہمارے لئے یہ چنداں پریشانی کا باعث نہ ہوگا۔ ہمارے پروپرائیٹر آگے ہی دو تین مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ سٹاف بہت بڑھ رہا ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے ہماری ترقی بھی روک دی ہے عجب نہیں کہ جب ہم دفتر میں اکیلے رہ جائیں تو وہ ہمیں ترقی دینے پر آمادہ ہو جائیں وہ اصولاً اسٹاف بڑھانے کے خلاف ہیں دانشمندانہ انداز میں کہتے ہیں کہ سٹاف زیادہ ہو تو بات باہر نکل جاتی ہے۔ یہ معلوم کبھی نہیں ہوا کہ کیا بات ؟ کونسی بات ؟ اپنے ڈپو پر بھی وہ اکیلے ہی کام کرتے ہیں اور اس کی وجہ بھی یہی بتاتے ہیں کہ ورنہ بات باہر نکل جائے گی۔

بچّے

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بچّوں کی کئی قسمیں ہیں مثلاً بلی کے بچے، فاختہ کے بچے وغیرہ میری مراد صرف انسان کے بچّوں سے ہے جن کی بظاہر تو کئی قسمیں ہیں، کوئی پیارا بچّہ ہے کوئی ننھا بچّہ ہے، کوئی پھول سا بچہ ہے، کوئی چاند سا بچہ ہے۔ لیکن یہ سب اس وقت تک کی باتیں ہیں جب تک برخوردار پنگوڑے میں سویا پڑا ہے۔ جہاں بیدار ہونے پر بچّے کے پانچوں حواس کام کرنے لگے، بچّے نے ان سب خطابات سے بے نیاز ہو کر ایک الارم کلاک کی شکل اختیار کر لی۔

یہ جو میں نے اوپر لکھا ہے کہ بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگ جاتے ہیں یہ میں نے اور حکماء کے تجربات کی بنا پر لکھا ہے ورنہ حاشا وکلّا میں اس بات کا قائل نہیں۔

کہتے ہیں بچہ سُنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے لیکن مجھے آج تک سوائے اسکی قوتِ ناطقہ کے اور کسی قوت کا ثبوت نہیں ملا۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ روتا ہُوا بچّہ میرے حوالے کر دیا گیا ہے کہ ذرا اسے چپ کرانا۔ میں نے جناب اس بچے کے سامنے گانے گائے ہیں، شعر پڑھے ہیں، ناچ ناچے ہیں۔ تالیاں بجائی ہیں، گھٹنوں کے بل چل کر گھوڑے کی نقلیں اتاری ہیں۔ بھیڑ بکریوں کی آوازیں نکالی ہیں، سر کے بل کھڑے ہو کر ہوا میں بائیسکل چلانے کے نمونے پیش کئے ہیں۔ لیکن کیا مجال جو اس بچّے کی

یکسوئی میں ذرا بھی فرق آیا ہو جس سُر پر اس نے شروع کیا تھا اس سے ذرا بھی نیچے اُترا ہو اور خدا جانے ایسا بچہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے تو کس وقت؟

بچے کی زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہو جب اس کے لئے کسی نہ کسی قسم کا شور ضروری نہ ہو اکثر اوقات تو وہ خود ہی سامعہ نوازی کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ یہ فرض ان کے لواحقین پہ عاید ہوتا ہے۔ ان کو سلانا ہو تو لوری دیجئے۔ ہنسانا ہو تو مہمل سے فقرے بے معنی سے بے معنی منہ بنا کر بلند سے بلند آواز میں ان کے سامنے دہرائیے اور کچھ نہ ہو تو شغل بے کاری کے طور پر ان کے ہاتھ میں ایک جھنجنا دے دیجئے۔ یہ جھنجنا بھی کمبخت کسی بے کار کی ایسی ایجاد ہے کہ کیا عرض کروں یعنی ذرا سا آپ ہلا دیجئے لڑھکا چلا جاتا ہے اور جب تک دم میں دم ہے اس میں سے ایک ایسی بے سُری کرخت آواز متواتر نکلتی رہتی ہے کہ دنیا میں شاید اس کی مثال محال ہے۔ اور جو آپ نے ماما یا "ابا جان" کے جوش میں آکر برخوردار کو ایک عدد ربڑ کی گڑیا منگوا دی جس میں ایک بہت ہی تیز آواز کی سیٹی لگی ہوتی ہے تو بس پھر خدا حافظ! اس سے بڑھ کر میری صحت کے لئے مضر چیز دنیا میں اور کوئی نہیں سوائے شاید اس ربڑ کے تھیلے کے جس کے منہ پر ایک سیٹی دار نالی لگی ہوتی ہے اور جس میں منہ سے ہوا بھری جاتی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو والدین کہلاتے ہیں۔ بدقسمت ہیں تو وہ بے چارے جو قدرت کی طرف سے اس ڈیوٹی پر مقرر ہوئے ہیں کہ جب کسی عزیز یا دوست کے بچے کو دیکھیں تو ایسے موقع پر ان کے ذاتی جذبات کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ یہ ضرور کہیں کہ کیا پیارا بچہ ہے۔

میرے ساتھ کے گھر ایک مرزا صاحب رہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے چھ بچوں کے والد ہیں۔ بڑے بچے کی عمر نو سال ہے بہت شریف آدمی ہیں۔ ان کے بچے بھی بے چارے بہت ہی بے زبان ہیں جب ان میں سے ایک روتا ہے تو باقی کے سب چپکے بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ جب وہ روتے روتے تھک جاتا ہے تو ان کا دوسرا

برخوردار شروع ہو جاتا ہے۔ وہ ہار جاتا ہے تو تیسرے کی باری آجاتی ہے۔ رات کی ڈیوٹی والے بچے الگ ہیں۔ ان کا سُر ذرا باریک ہے۔ آپ اُنگلیاں چٹخوا کر، سر کی کھال میں تیل جھسوا کر، کانوں میں روئی دے کر، لحاف میں سر لپیٹ کر سوئیے۔ ایک لمحہ کے اندر آپ کو جگا کے، اٹھا کے بٹھا نہ دیں تو میرا ذمہ۔

انہی مرزا صاحب کے گھر پہ جب میں جاتا ہوں تو ایک ایک بچے کو بلا کر پیار کرتا ہوں اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں۔ کئی دفعہ دل پہ آیا مرزا صاحب سے کہوں حضرت! آپ کی ان نغمہ سرائیوں نے میری زندگی حرام کر دی ہے۔ نہ دن کو کام کر سکتا ہوں نہ رات کو سو سکتا ہوں۔ لیکن میں کہنے ہی کو ہوتا ہوں کہ ان کا ایک بچّہ کمرے میں آجاتا ہے اور مرزا صاحب ایک والدانہ تبسّم سے کہتے ہیں۔ اختر بیٹا! ان کو سلام کرو۔ سلام کرو بیٹا، اس کا نام اختر ہے صاحب بڑا اچھا بیٹا ہے۔ کبھی ضد نہیں کرتا، کبھی نہیں روتا، کبھی ماں کو دق نہیں کرتا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ وہی نالائق ہے جو رات کے دو بجے گلا پھاڑ پھاڑ کر روتا ہے مرزا صاحب قبلہ تو شاید اپنے خراٹوں کے زور شور میں کچھ نہیں سنتے، بدبختی ہماری ہوتی ہے لیکن کہتا یہی ہوں کہ "یہاں آؤ بیٹا" گھٹنے پر بٹھا کر اس کا منہ بھی چومتا ہوں۔

خدا جانے آج کل کے بچّے کس قسم کے بچے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم بقرعید کو تھوڑا بہت رو لیا کرتے تھے اور کبھی کبھار کوئی مہمان آ نکلا۔ تو نمونے کے طور پر تھوڑی سی ضد کر لی! کیونکہ ایسے موقعہ پر ضد کارآمد ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہ کہ چوبیس گھنٹے متواتر روتے رہیں ایسی مشق ہم نے کبھی بہم نہ پہنچائی تھی۔

پطرس کے مضامین

کُتّے

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا۔ سلوتریوں سے دریافت کیا۔ خود سر کھپاتے رہے۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجئے۔ دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجئے۔ دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا۔ تو لگاتار بغیر دم لئے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔ تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انھوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرعہ دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا۔ ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر لپکے اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدرشناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ کمبخت بعض تو دوغزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر آرڈر" پکارا۔ لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب اُن سے کوئی پوچھے کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہواؤں میں جا کر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آکر سوتوں کو ستانا کونسی شرافت ہے۔

اور پھر ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بھی ہے۔ اس کا ذکر ہی جانے دیجئے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات ہے یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ خدا کی قسم اُن کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جونہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے۔ کتے نے برآمدے ہی میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کر دی، اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کر دی۔ چوکیداری کی چوکیداری۔ موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سُر۔ نہ سَر نہ پیر۔ تان پہ تان لگائے جاتے ہیں۔ بے تالے کہیں کے۔ نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں۔ گلے بازی کئے جاتے ہیں۔ گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں لیکن ہم سے قسم لے لیجئے۔ جو ایسے موقع پر ہم نے کبھی ستیہ گرہ سے منہ موڑا ہو۔ شاید آپ اس کو تعلّی سمجھیں لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کبھی کسی کتے پر ہاتھ اٹھ ہی نہ سکا۔ اکثر دوستوں نے صلاح دی۔ کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہیئے کہ دافع بلیات ہے۔ لیکن ہم کسی سے خواہ مخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔ شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگالیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک ہے۔ ایسے موقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں تو کھرج کی سروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیتہ الکرسی آپ کے ذہن سے اُتر جائے گی۔ اس کی جگہ آپ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض اوقات ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں۔ اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں، چونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں۔ اور نو مشقی کا عالم بھی ہے۔ اس لئے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بے سرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی سمجھے گا۔ انگریزی موسیقی ہے اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی، ذرا تصور ملاحظہ ہو۔ آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا۔ ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا۔ گویا بہت ہی بڑا کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی۔ لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں۔ اس لئے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس گوشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ تاریخی مصرعہ دعائیہ ہوتا کہ ”اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو“ لیکن ۔۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگِ رہ بری بلا ہے

مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا ؟؟

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں، سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں۔ یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بچوں، بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھر کم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لئے بھونک لے۔ تو ہم بھی چار و ناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہوا ہونا چاہیئے) لیکن یہ کمبخت

دو روزہ سہ روزہ دو دو تین تین تولے کے پلّے بھی بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک آواز ذرا سا پھیپھڑا اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دُم تک پہنچتی ہے۔ اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آکر گویا اُسے روک ہی تو لیں گے۔ اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو، تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں۔ لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کر دیگا۔

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطّل کر دیتی ہے۔ خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے اُن کا ایک پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آکر تبلیغ کا کام شروع کر دے تو آپ ہی کہئیے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟ ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ ان کا شور کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیرِ لب) بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی سکنات ہماری) اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کر سکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے نہیں معلوم کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مارے گا؟ بہر صورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابلِ نفرین رہی ہے۔ اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آکر کہدے کہ عالی جناب، سڑک بند ہے، تو خدا کی قسم ہم بغیر چوں و چرا واپس لوٹ جائیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گزار دی ہیں۔ لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ و متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے۔ (قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر ان کا کوئی عزیز و محترم کتا کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔ مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں)

خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں۔ کتے اس کلیئے سے مستثنیٰ نہیں۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں — جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دُم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لئے لیٹ جاتا ہے۔ اور

آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ تشکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا۔ گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا۔ لوگوں سے کہلوایا۔ خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ صورت حالات کو ایک نظر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا۔ تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے ایسی چھچھوری چیزوں کے لئے وہ رستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ رات کے وقت یہی کتا' اپنی خشک پتلی سی دم کو تا بحدِ امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا۔ انہوں نے غیظ و غضب کے لہجہ میں آپ سے پرسش شروع کر دی: "بچہ فقیروں کو چھیڑتا ہے۔ نظر نہیں آتا ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔" بس اس فقیر کی بد دعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں۔

اگر خدا مجھے کچھ عرصے کے لئے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لئے کسولی پہنچ جائیں۔ ایک شعر ہے ؎

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را

یہی وہ خلاف فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے"۔ یہ بجا ہے لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔

میں ایک میاں ہوں

میں ایک میاں ہوں۔ مطیع و فرمانبردار۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر ایک بات سے آگاہ رکھنا اصول زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ سے اس پر کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آرا کو بُرے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے۔ انہیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لئے باعثِ ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجئے۔ اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمہ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں۔ لیکن شکل و صورت ایسی پاکیزہ ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جوا وہ نہیں کھیلتے۔ گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں۔ جیب کترتے

ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں۔ انہی سے جی بہلاتے ہیں ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلّے کا کوئی بد معاش جوئے میں قید ہو جائے تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلّی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب کہتے تھکتی نہیں ہے۔ ہمارے گھر میں "موئے کبوتر باز" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل کوّے، گدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال آ جاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا ہے۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ میں میری جانب گریز، کبھی لمبی بحر میں کبھی چھوٹی بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں نے مصمّم ارادہ کر لیا کہ اس مرزا کمبخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا۔ آخر گھر سب سے مقدّم ہے۔ میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے؟ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ کہنے لگے۔ اندر آ جاؤ۔ ہم نے کہا نہیں آتے۔ تم باہر آؤ۔ خیر آخر اندر گیا۔ بدن پر تیل مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لئے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔ بیٹھ جاؤ۔ ہم نے کہا بیٹھیں گے نہیں۔ آخر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے۔ مرزا بولے کیوں بھئی خیر باشد! میں نے کہا کچھ نہیں۔ کہنے لگے اس وقت کیسے آنا ہوا؟

اب میرے دل میں فقرے کھلنے شروع ہوئے پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالوں اور چل دوں۔ پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا۔ اس لئے کسی ڈھنگ سے بات شروع کروں لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔ آخر ہم نے کہا:

مرزا بھئی کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں؟

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل افشانی کرتے رہے۔ اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یونہی چلے آئے۔ لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہو گئی۔ ہم نے کہا چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح ہو گئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لئے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کارآمد ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات قبیحہ کی جھلک نظر آتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اُٹھا کرتے تھے۔ ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے۔ اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اٹھنے میں کوتاہی کریں تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے۔ سردی کا موسم۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ صابن سر پہ ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا۔ کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پراسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا۔ اور پھر گانے لگے کہ "توری چھل بل ہے نیاری ․ ․ ․ ․ ․ ․" اس کو ہماری انتہائی بد مذاقی سمجھا گیا اور اس بد مذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔

لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھائی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لئے اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے۔ روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے۔ اور پھر اس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگی تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے چلی جاؤں؟ میں نے کہا اور کیا؟

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہو گئی۔ اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کئے۔ یعنی اب بے شک دوست آئیں۔ بے شک اودھم مچائیں۔ میں بے شک کھاؤں۔ بے شک جب چاہوں اٹھوں۔ بے شک تھیٹر جاؤں۔ میں نے کہا:

"روشن آرا جلدی کرو۔ نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی؟"

ساتھ اسٹیشن پر گیا۔ جب گاڑی میں سوار کرچکا تو کہنے لگی۔ خط ضرور لکھتے رہیے؟ میں نے کہا "ہر روز اور تم بھی؟"

کھانا وقت پر کھا لیا کیجئے۔ اور ہاں دھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں؟"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے میرا دل بھی بے تاب ہونے لگا۔ اور جب گاڑی روانہ ہوئی تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کتابوں کی دکان تک آیا اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا۔ تہ کر کے جیب میں ڈالا۔ اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کرلیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں چاہوں جاؤں۔ چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں۔ دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں۔

کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ رکھا جاتا ہے تو گو وہ وہاں کی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی

ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا۔ سگریٹ سلگایا، ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا۔ تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا۔ باہر ہی سے لڑکر کو آواز دی۔

"امجد!"

"حضور!"

"دیکھ حجام کو جا کے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے"

"بہت اچھا"

"گیارہ بجے سن لیا نا؟ کہیں روز کی طرح پھر چھ بجے وارد نہ ہو جائے؟"

"بہت اچھا حضور"

"اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو"

یہاں سے کلب پہنچے۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو سنسان آدمی کا نام نشان تک نہیں سب کمرے دیکھ ڈالے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی، تاش کا کمرہ خالی۔ صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا۔

اس سے پوچھا "کیوں بے آج کوئی نہیں آیا؟"

کہنے لگا "حضور آپ جانتے ہیں۔ اس وقت بھلا کون آتا ہے؟"

بہت مایوس ہوا۔ باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے۔ دفتر پہنچا۔ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے سب حال بیان کیا۔ کہنے لگے:

"تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو۔ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ بس ابھی بھگتا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں شام کا پروگرام کیا ہے؟"

میں نے کہا "تھیٹر!"

کہنے لگے " بس بہت ٹھیک ہے۔ تم باہر بیٹھو میں ابھی آیا"۔
باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی۔ اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا۔ ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالے اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔
آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔ جمائی پہ جمائی۔ جمائی پہ جمائی۔ حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔
اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیں۔ لیکن اس سے بھی تھک گیا۔
پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔
بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا۔ "طبلے یار اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا۔ مردود کہیں کا۔ سارا دن میرا ضائع کر دیا"۔
وہاں سے اٹھ کر مرزا کے گھر گئے۔ شام بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کلب میں کھایا اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لئے تھیٹر گئے۔ رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے۔ تکئیے پر سر رکھا ہی تھا کو نیند نے بے ہوش کر دیا۔
صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے سگریٹ اٹھایا اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا۔ اور پھر اونگھنے لگا
گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا۔ کہنے لگا "حضور حجام آیا ہے"۔
ہم نے کہا "یہیں بلا لاؤ"۔ یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوالیں۔ اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لئے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی جس کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا۔ تو خدا جانے کیا خیال دل میں آیا۔ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور سودائیوں کی طرح اس رومال کو تکتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سرمئی رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر پڑا۔ باہر نکالا۔ ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا

رہا۔ دل بھر آیا۔ گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالا۔ لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بیتاب ہو گیا۔ اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے۔ لیکن نامعلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر رہا نہ گیا۔ باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہنچا۔ وہاں سے تار دیا کہ میں بہت اداس ہوں تم فوراً آ جاؤ!

تار دینے کے بعد دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ یقین تھا کہ روشن آرا اب جس قدر جلد ہو سکے گا آ جائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔ اس لئے تجویز ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی۔ سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ امجد سے کہہ دیا گیا کہ حقے میں اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں اور پان اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کچھ مرد ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا جو کھیل بھی کھیلا گیا۔ بہت معقول طریقے سے۔ قواعد و ضوابط کے مطابق اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ۔ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیئے یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں کہ ایک آدھ کام کا پتہ اڑا نہیں اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اڑنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے۔ کوئی فرش پر بازو ٹیکے سیٹی بجا رہا ہے۔ کوئی تھیٹر کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے۔ لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہوا اور ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کیا۔ جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے۔ دوسرا وزیر تیسرا کوتوال۔ اور جو سب سے ہار جاتا ہے وہ چور۔ سب نے کہا: "واہ واہ کیا بات کہی ہے!" ایک بولا "پھر آج جو چور بنا۔ اس کی

شامت آجائے گی۔" دوسرے نے کہا: "اور نہیں تو کیا۔ بھلا کوئی ایسا ویسا کھیل ہے۔ سلطنتوں کے معاملے ہیں سلطنتوں کے۔"

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے: "ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کے لائے۔" کوئی کہے" نہیں حضور سب کے پاؤں پڑے اور ہر ایک سے دو دو چانٹے کھائے۔" دوسرے نے کہا: "نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے۔" آخر میں بادشاہ سلامت بولے: "ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے۔ اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے اور یہ اسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے۔" سب نے کہا کیا دماغ پایا ہے حضور نے۔ کیا سزا تجویز کی ہے۔ واہ واہ۔"

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا: "تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں۔ کل کسی اور کی باری آجائے گی۔" نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بیہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شان استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیئے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی۔ منہ سے برقعہ اٹھا۔ تو روشن آرا!

دم خشک ہو گیا۔ بدن پر ایک لرزہ طاری ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی۔ سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا۔ کہ تم فوراً آجاؤ میں بہت اداس ہوں۔ اور اپنی یہ حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں اور مردانے سے قہقہوں کا شور برابر آرہا ہے۔

روح منجمد ہو گئی اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی۔ اور پھر کہنے لگی ...... لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے کہ میں بذاتِ خود ازحد شریف واقع ہوا ہوں۔ جہاں تک میں ہوں۔ مجھ سے بہتر میاں دنیا پیدا نہیں کر سکتی۔ میرے سسرال میں سب کی یہی رائے ہے اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے۔ لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کر دیا ہے۔ اس لئے میں نے مصمّم ارادہ کر لیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا۔ سوائے ڈاکئے یا حجام کے۔ اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

"خط ہے ؟"

"جی ہاں"

"دے جاؤ۔ چلے جاؤ"

"ناخن تراش دو"

"بھاگ جاؤ!"

بس اس سے زیادہ کلام نہ کروں گا۔ آپ دیکھئے تو سہی!

منظومات

دلّی کی سیر

ایک چھوٹا سا لڑکا الہ آباد کا
اپنے گھر سے چلا اور دہلی گیا

واں جو پہنچا تو دیکھا
کہ اس جا کے لڑکے — ہیں ویسے ہی ننھے
اور اس جا کے گنّے — ہیں ویسے ہی لمبے
اور اس جا کی برفی — ہے ویسی ہی میٹھی
اور اس جا کی بلّی — ہے ویسی ہی موٹی
اور اس جا کی چڑیاں — ہیں ویسی ہی چھوٹی
اور اس جا کے چالیس — ہیں بیس اور بیس
اس نے یہ کچھ جو دیکھا
تو حیراں ہوا اور تکتا رہا
اور تکتا رہا اور حیراں ہوا

میکدے میں

جو تو کہے تو کسی میکدے میں چل بیٹھیں
جو دل کی بات ہے دل میں وہ دل کی بات کریں

میں خُم کے سائے میں سرگوشیاں کروں ایسی
کہ تیرے لب مری ہر بات کو نبات کریں

جو بے ثبات ہے دُنیا تو بے ثبات سہی
فریبِ مے سے اسے اور بے ثبات کریں

اگر مُنارۂ کسریٰ پہ دن نکل آئے
تو چشم وا نہ کریں اور دن کو رات کریں

سفرِ انگلستان

(خطوں کے پیرائے میں)

۱۰ ستمبر ۱۹۳۶ء دو بجے دوپہر

امتیاز بھائی! یہ خط بحیرۂ احمر میں ایک ایسے مقام سے لکھ رہا ہوں جو عدن سے ۹۰۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ ذرا اندازہ لگاؤ میں اس وقت بمبئی سے ڈھائی ہزار میل کے فاصلے پر ہوں جو پشاور سے ڈیڑھ ہزار میل دور ہے اور ابھی منزل مقصود کا پتہ ہی نہیں اسے کہتے ہیں سفر۔ لاہور سے امرتسر کا سفر اس کے مقابلے میں چہل قدمی سا معلوم ہوتا ہے

خیر اپنی   کو ابتدا سے شروع کروں۔ بمبئی پہنچے تو کمپنی والوں کی طرف سے نوٹس ملا کہ یکم ستمبر کو جہاز پر پہنچ جائیں۔ وہاں ڈاکٹری معائنہ ہوگا۔ ہمارا ٹمپریچر پہلے ہی ڈانواڈول ہو رہا تھا۔ دعائیں مانگتا گیا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ وہ معائنہ ہے جو جہازوں کے قوانین کے مطابق ہر جہاز کی روانگی سے پیشتر ہونا ضروری ہے۔ اس معائنے کی کیفیت میں یوں ہی بیان کر سکتا ہوں کہ جس کی نبض چلتی ہے اسے تو جانے دیتے ہیں۔ جس کی نبض بند ہو اسے بمبئی میں ہی روک لیتے ہیں۔

جہاز پر سوار ہوئے تو بھانت بھانت کے جانور دکھائی دیئے۔ ہندوستانیوں کی تعداد میری توقعات سے بہت زیادہ تھی۔ بنگال۔ مدراس۔ پنجاب۔ یوپی۔ بمبئی سبھی

صوبوں کے لوگ تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر ایک صوبے کی گورنمنٹ نے اپنے ہاں کے سب سے بڑے چغدوں کو چن کر بھیجا ہے۔ ایک سے ایک نرالی صورت کا آدمی اور ان میں سے ہر ایک اپنی وضع کی انگریزی بولتا ہے۔ بعض انسان نما حیوان ہیں کہ پھولوں سے لدے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ اور رومال سے آنسو پونچھ رہے ہیں بعض ایسے ہیں جو اپنے آپ کو بہت "ایٹ ہوم" ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور اس اظہار کے لئے جو کبھی اِدھر سے اُدھر اور کبھی اُدھر سے اِدھر تیز تیز قدم اٹھائے نکل جاتے ہیں۔ جیسے جہاز کے انتظام و انصرام میں مصروف ہوں۔

آخر جہاز روانہ ہوا اور جہاز پر سے بھی اور ساحل پر سے بھی رومال ہلنے شروع ہوئے کئی دیسی شرفا معلوم ہوتا تھا' برسوں سے رومال ہلانے تک کے انتظار میں تھے۔ دل کھول کر "روما لائے" ان میں سے ان کا اضطراب دیکھنے کے قابل تھا جو اپنی سب جیبوں کو ٹٹول رہے ہیں اور رومال نہیں ملتا۔ اور جب کسی حضرت کا رومال چھوٹ کر سمندر میں گر جاتا تو ان کی حسرت قابلِ دید ہوتی جب ساحل آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو یہ طوفانِ بدتمیزی تھما اب جہاز کی کیفیت یہ ہے کہ ہر فرد بشر کرسی بچھائے جہاز پر بیٹھا ہے اور سمندر کو دیکھ رہا ہے۔ چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دل میں کہہ رہے ہیں۔ "اچھا تو گویا یہ سمندر ہے"۔ تو گویا اب ہم سمندر میں ہیں۔ بھئی بہت اچھے۔" جو دوست ہیں وہ ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں۔ اور ابھی سے وینس۔ لندن اور ایڈمبرا کے متعلق نہایت واقف کارانہ انداز اور بے پروائی کے لہجے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ ایک کونے میں میں بھی بیٹھا سمندر کو دیکھ رہا ہوں۔

تھوڑی دیر میں ہم ساحل سے بہت دور نکل گئے۔ ہوا تیز ہونے لگی اور سمندر میں یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی گھٹیا سے مصوّر نے کوئی تصویر کھینچی ہے۔ بھوک کے مارے آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں۔ اور میں بے صبری سے کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ میں دور افق کو بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ یک لخت معلوم ہوا جیسے اُفق کچھ ٹیڑھا سا ہو گیا ہے جیسے ترازو

کی ڈنڈی ایک طرف کو جھکی ہوئی نظر آتی ہے۔ لمحے بھر کے بعد آپ دوسری طرف کو جھک گئے ایک دو منٹ نہ گزرے تھے کہ ایسے معلوم ہوا جیسے کسی نے دفعتاً ٹخنوں اور گھٹنوں کے پیچ ڈھیلے کر دیئے ہوں۔ معدے میں ایک برف کا گولہ بہت زور سے نیچے کو گرا۔ انتڑیوں نے اُچھل کر پھیپھڑوں کے ایک گھونسا مارا اور کھوپڑی کے اندر بھیجے نے آہستہ آہستہ پنڈولم کی طرح جھولنا شروع کر دیا اور پھر قے۔

یہ ابتدائے عشق تھی۔ ہم بھاگے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچے اور بستر پر چت لیٹ کر اس شخص کے خاندان بھر کو کوسنے لگے۔ جس نے ہمیں ولایت آنے کا مشورہ دیا تھا۔ بس امتیاز! کچھ پوچھ مت۔ دنیا میں ایسی تکلیف دہ بیماری کوئی نہ ہو گی۔ موت بھی خوشگوار معلوم ہونے لگتی ہے۔ مجھے کمرے میں پہنچے ہوئے چار پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ نزدیک دور سے دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آنے لگیں اور تھوڑی دیر میں ہر طرف سے قے کی ندائیں بلند ہوئیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے توپ خانہ داغا جا رہا ہے جب کھانے کی گھنٹی بجی تو تمام جہاز چت پڑا تھا۔ "کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی"

پانچ دن رات میں بستر پر پڑا رہا۔ دوسرے دن شام کو ڈاکٹر کو بلایا۔ ایک فرانسیسی لونڈا سا ہے۔ شکل ہیرلڈ لائیڈ سے بہت ملتی ہے انہوں نے آتے ہی بے تحاشا فرنچ شروع کر دی اور متواتر بیس منٹ تک بکتا چلا گیا۔ اتنا سمجھ میں آیا کہ انجکشن کریں گے چنانچہ کیا۔ اس سے قے تو بند ہو گئی لیکن دماغ برابر جھولا جھول رہا تھا۔ سمندر میں بہت بڑی بڑی لہریں اُٹھ رہی تھیں اور جہاز پر جیسے وجد کی کیفیت طاری ہو۔ ہر لمحہ طوفان بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ چھٹے دن کچھ افاقہ ہوا۔ تو ہم ہمت کر کے تختۂ جہاز پر پہنچے۔ اور ایک کرسی پر لیٹ گئے۔ ہماری طرح اور بھی کئی کشتگانِ ناز باری باری باہر نکل رہے تھے شکلیں چوہوں کی طرح بنی ہوئی۔ چال ایسی جیسے ہوا میں تنکا اڑتا ہوا جا رہا ہو۔ جہاں بیٹھتے تھے۔ بیٹھتے ہی آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ لیکن طوفان کے تھمتے ہی طبیعت فوراً ٹھیک ہو گئی۔ اور

ایک آدھ گھنٹہ کے اندر ہی اس قدر زور کی بھوک لگنے لگی کہ عمر بھر نہ لگی تھی۔ جہاز پر دن میں پانچ مرتبہ کھانے پر جمع ہوتے ہیں۔ مجھے نہیں یاد کہ کسی وقت بھی کھانے کے کمرے میں بے تابانہ داخل نہ ہوا ہوں۔

کھانے کے کمرے کی دنیا ہی نرالی ہے۔ ہندوستانی بھائیوں کے لئے اس کمرے کے اندر طرح طرح کی مایوسیوں، بے عزتیوں اور خفتوں کے سامان موجود ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ اتنے عرصہ سے ولایت آنے کی تیاریاں کرتے رہتے ہیں وہ ساتھ ہی ساتھ چھری کانٹے کے استعمال کی مشق کیوں نہیں کر لیتے اور انگریزی کھانے کے آداب و قواعد کیوں نہیں سیکھ لیتے۔ ویشنو حضرات کے لئے اور بھی مصیبت ہے۔ بار بار پوچھتے ہیں اس میں گوشت کی تو کوئی آمیزش نہیں۔ اس میں یخنی تو نہیں ڈالتے۔ یہ چربی میں پکا ہے یا مکھن میں۔ آئس کریم میں انڈے تو نہیں پڑتے۔ ٹفن اور ڈنر پر دس دس بارہ بارہ قسم کے کھانے ہوتے ہیں۔ لیکن ان بے چاروں کے پلے ایک دو اُبلی ہوئی ترکاریوں سے زیادہ نہیں پڑتا۔ ہونقوں کی طرح سے چھری اور کانٹے دونوں کو بائیں ہاتھ میں تھامے رہتے ہیں۔ اور دائیں ہاتھ کے ساتھ چمچے سے کھائے جاتے ہیں۔ آئس کریم کے چمچے کو نمک کلھیا میں ڈال دیتے ہیں اور پھر نمک کے چمچے سے آئس کریم کھانے لگ جاتے ہیں۔ اور پھر کھاتے کھاتے ہر وقت مجرم نظروں سے دائیں بائیں جھانکتے رہتے ہیں۔ کسی کو دائیں ہاتھ میں چھری پکڑے دیکھا تو خود بھی دائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور پھر جو کسی کو دیکھا کہ بائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے ہے تو بائیں ہاتھ میں منتقل کر لی۔ سور کا گوشت ہر روز کھانے پر ہوتا ہے لیکن بھائی اب تک تو ہم نے کھایا نہیں۔ آگے بھی خدا حافظ و نگہبان ہے۔

عدن پہنچے تو ساحل پر گئے۔ ہم چار آدمیوں نے مل کر ایک ٹیکسی کرایہ پر لی جس پر سوار ہو کر ہم عدن اور عدن کے گرد و نواح ۲۵ میل گھومے۔ اس کا کرایہ کوئی ایک پونڈ کے قریب

بنا۔ وہ غوطہ لگانے والے لڑکے بہتیرا تلاش کئے کہیں نظر نہ آئے۔ خدا جانے متقدمین یونہی گپیں ہانکتے تھے یا اب ان کی نسل ہی ناپیدا ہوگئی ہے۔ عدن ہندوستان کے عام شہروں کی نسبت بہت بڑا شہر ہے لیکن بہت بے رونق سا مقام ہے۔ پارسیوں کی دکانیں جابجا نظر آتی ہیں۔ عدن میں پہنچ کر ٹکٹ وغیرہ خریدے اور خط پوسٹ کئے۔ تمہیں ایک پوسٹ کارڈ بھیجا تھا جس پر میرے جہاز کی تصویر تھی۔ امید ہے ملا ہوگا۔

یہاں سے ۷ ستمبر کو دن کے ۱۲ بجے روانہ ہوئے اور بحیرۂ احمر میں داخل ہوئے جہاں کی گرمی توقع سے بہت ہی کم ہے البتہ رات کو کمرے کے اندر نہیں سویا جاسکتا۔ دن بھر سب سے اوپر کے تختے پر کرسی بچھائے بیٹھا رہتا ہوں۔ اور رات کو وہیں بستر بچھوا کر سوتا ہوں۔ طلوع اور غروب کے نظارے لبا اوقات بہت ہی شاندار ہوتے ہیں۔ وسیع سمندر وسیع آسمان اور آفتاب کا بہت بڑا آتشیں گولہ۔ جب صبح ہوتی ہے یا شام پڑتی ہے تو روح جیسے پھیلنے لگ جاتی ہے۔

ایک دن رات کو جزیرہ پیرم کے پاس سے گزرے۔ جزیرے کے ایک سرے پر لائٹ ہاؤس نے جس کی روشنی ایک ایک منٹ کے وقفہ کے بعد چمکتی ہے۔ اور جزیرے سے لے کر جہاز تک ایک چمکتا ہوا شاہراہ سا بچھا دیتی ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جزیرے کے ٹیلوں کی مدھم سی قطار دکھائی دیتی تھی۔ یہ تمام نظارہ کچھ ایسا پُراسرار معلوم ہوتا تھا کہ مجھے عمر بھر نہ بھولے گا۔

جب سے سمندر کا طوفان بند ہوا ہے۔ ہر روز رات کو سینما کا تماشا اور ناچ ہوتا ہے کھانے پر ہی دعوتی رقعہ مل جاتا ہے۔ ایک پروگرام بھی تمہیں اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ تماشا جہاز کے تختے پر ہوتا ہے۔ نہ کہ بند کمرے میں۔ اور مفت ہوتا ہے اچھا خاصا لطف رہتا ہے۔ ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا گراموفون بمنزلہ بینڈ کے بجتا ہے۔ سوائے ایک فلم کے The Back Biter باقی کی سب میرے لئے نئی تھیں۔ اس پروگرام کی

فلم ۲ ہیرلڈ لائڈ کا مک تھا۔ دل بہلا وے کو کافی سامان ہے۔ باقاعدہ سینما نہ سمجھو
اب ہم بحیرۂ احمر میں ہیں۔ مکّے اور مدینے کے عرض البلد سے اوپر گزر چکے ہیں شروع
شروع میں ساحل عرب کے پاس اکثر جزیرے نظر آتے رہے۔ اب کوئی ساحل نظر نہیں آتا کل
دوپہر کو سویز پہنچنے کی توقع ہے۔ پرسوں پورٹ سعید۔ جہاں یہ خط پوسٹ کروں گا۔ ہوا بہت
خوشگوار اور فرحت افزا ہے۔ سمندر کا رنگ بالکل سلیٹ کا سا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھ
رہی ہیں اور افق تک جابجا سفید جھاگ کے گالے سے دکھائی دے رہے ہیں۔ جہاز تھوڑا
سا ڈگمگانے لگ گیا ہے جس کی وجہ سے لکھنا مشکل ہوگیا ہے۔

روانہ ہونے سے پہلے تمہیں یاد ہوگا میں نے اسی کمپنی کے پراسپکٹس وغیرہ منگائے تھے
ان میں لکھا تھا کہ جہاز پر انگریزی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ایک حد تک
ٹھیک ہے۔ مسافر تو انگریزی بول بھی لیتے ہیں اور سمجھ بھی لیتے ہیں ورنہ جہاز کے افسر
اور ملازم بس اشارے۔

بہت سی باتیں کہنے کو ہیں۔ خطوں کے بس کا روگ نہیں۔ واپس انشاءاللہ پہنچوں۔ تو
سناؤں گا۔ ہزار ہا لطیفے ہیں جو عمر بھر نہ بھولیں گے۔ قبلہ مولوی صاحب۔ حمید علی صاحب
سالک صاحب۔ جگل صاحب۔ منشی صاحب۔ اختر صاحب۔ حفیظ صاحب سب
کو میرا نیازمندانہ سلام، بہت یاد آتے ہیں۔ کیا کروں۔

خاکسار
بخاری

(۲)

لندن ۲۲ ستمبر ۱۹۲۶ء

امتیاز بھائی! میں تم کو وینس یا یورپ کے کسی اور مقام سے خط لکھتا لیکن اس لئے
نہ لکھا کہ یورپ کا سفر ایک ہنگامہ تھا جس میں میں ہندوستان کو تقریباً بھول ہی گیا اور

دوسرے اٹلی اور سوئٹیزرلینڈ میں ہندوستانی ڈاک کا انتظام کچھ ایسا ہے کہ وہاں کا لکھا ہوا خط تم کو ان خصوصاً جلدی نہ ملتا۔ پچھلا خط میں نے آپ کو سوئیز سے لکھا تھا اور پورٹ سعید میں پوسٹ کیا تھا۔ پورٹ سعید میں ہمارا جہاز دن کے دس بجے پہونچا۔ کشتیوں میں سوار ہو کر ساحل پر گئے۔ پورٹ سعید کی عمارتیں نہایت خوش وضع اور خوبصورت ہیں حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق مغرب کی تقلید کی گئی ہے لیکن افریقی طرز تعمیر کا رنگ غالب ہے۔ بازار صاف ستھرے اور کشادہ ہیں۔ دکانیں خوش رنگ ہیں تعجب ہمیں اس بات پر ہوا کہ قہوہ خانوں کی تعداد بہت ہی زیادہ ہے۔ اور دن کے دس بجے بھی ان میں اس قدر بھیڑ تھی کہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کے لوگ بالکل بیکار ہیں۔ انگریزی سوٹ سر پر ترکی یا انگریزی وضع کی پھوس کی ٹوپیاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ بیٹھے کافی پی رہے ہیں۔ حقے کے کش لگا رہے ہیں اور جوا کھیل رہے ہیں۔ دکاندار بہت خوشامد اور چاپلوسی کے ساتھ دعوت دیتے ہیں۔ اگر آپ بے نیازی کے انداز میں چلدیں تو فحش گالیاں سناتے ہیں۔ بے شمار گائیڈ بازار میں چلنا مشکل کر دیتے ہیں۔ اور از حد بے حیائی کے مشاغل کے متعلق نہایت بے باکانہ گفتگو کرتے ہیں۔ آپ چیں بجبیں ہو کر ان سے کنارہ کریں تو گالیاں دینے لگ جاتے ہیں۔

بارہ بجے ہمارا جہاز وہاں سے روانہ ہوا اور ہم بحیرہ روم میں داخل ہوئے سب نے گرم کپڑے پہن لئے گو موسم کچھ اتنا سرد نہ تھا تاہم یورپ کی تعظیم لازم تھی۔ تین دن کے بعد ہم برنڈیزی (BRINDISI) پہنچے۔ وہاں بھی ساحل پر اُتر کر شہر کا ایک چکر لگایا برنڈیزی میں فروٹ بہت ہی سستا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم نے ایک بہت بڑا ٹوکرا کوئی دس آنے میں خرید لیا۔ اور پیٹ بھر کے کھایا۔ یہاں ہم نے پہلی مرتبہ اطالوی فوج اور پولیس کے سپاہیوں کو دیکھا۔ فوجی سپاہی کی وضع رابن ہڈ سے ملتی جلتی ہے۔ سر پر ولیسی ٹوپی اور اس میں ایک پر جس کا زاویہ بانکپن کی شان دکھا رہا ہے۔ پولیس کے افسر بڑے

بجیلے ڈیوک آف ولنگٹن کی سی ٹوپیاں پہنے سرخ اور نیلی وردی میں تنے کھڑے تھے جس پہ پیتل کی آرائش عجیب بہار دکھا رہی تھی۔ سفید دستانے اور چمکدار تلوار جب بازار میں کھٹ کھٹ کرتے گزرتے تھے تو آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔

ایک دن کے بعد شام کے وقت ہم وینس پہنچے اور وہاں جہاز کو الوداع کہا۔ وینس ایک معجزہ ہے۔ ایک طلسم ہے ایک رواں انگیز خواب ہے۔ اطالوی آتشیں شراب کے نشے کی ایک ترنگ ہے۔ جو مجھے عمر بھر نہ بھولے گی۔ اس سمندر کی شہزادی کے متعلق آپ نے جو کچھ سنا پڑھا ہے وہ سب ہیچ ہے۔ تصویریں اس کے حسن کی داد نہیں دے سکتیں۔ اور دنیا بھر کا لٹریچر یہاں کی دلکشی کا سماں نہیں باندھ سکتا۔ عورتیں نہایت حسین، خوش اخلاق خوش سلیقہ، مرد از حد با اخلاق، خوبصورت اور بانکے بانکے لمبے لمبے بال رکھتے ہیں اور ان کو بہت پریم سے سنوارتے ہیں۔ اکثر لوگ مرد اور عورتیں ننگے سر پھرتے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ ان کے بالوں کی خوبصورتی کو خوشنما سے خوشنما ٹوپی میں چھپانا بھی ظلم ہے۔ اخلاق کا یہ حال ہے کہ سارا دن آپ کے کانوں پر پیرمسیاں۔ پیرمسیاں (Permission) کی آواز آتی رہے گی جو انگریزی کے (Excuse me) کے مترادف ہے۔ لیکن جس لہجے، جس لوچ اور جس تبسم کے ساتھ کہا جاتا ہے وہ قوم انگلش کو عمر بھر نصیب نہیں ہو سکتا۔ رات کو وینس ایک دلہن ہے جس کا سنگھار کوئی ایسی زبان بیان کر سکتی ہے جس میں مجھے دسترس ہو Violin اور Bonjo اور Guitar وینس کی نہریں خوبصورت، نازک ہلکے ہلکے گنڈولے، ہفت رنگ کی روشنی، حسین لوگ جن کی زندگی شاد کام محبت کا ایک قہقہہ معلوم ہوتی ہے۔ امتیاز! خدا کی قسم یہیں مرنے کو دل چاہتا تھا۔ ہائے میں کیا کروں۔ ہندوستان میں کوئی بھی تو ایسی جگہ نہیں جس کا نام لے کر میں تم سے کہوں کہ وینس اس سے دس ہزار گنا ہوس انگیز ہے۔ ہندوستان کا تو ذکر ہی کیا۔ دنیا بھر میں کوئی ایسا مقام نہیں ہیں دن بھر Pirra San Marco (وینس کا ایک بہت مشہور چوک ہے)

میں کھڑا اپنی آنکھوں کی ساقی گری کرتا رہتا۔ تھارات کو گرینڈ کنال (Grand Canal)
کے کنارے جیسے نشے میں جھومتا رہتا تھا۔ ایک دن پورا سینٹ مارک کا گرجا
اور اکادیمیا دیکھنے میں گزرا ان کے حالات انشااللہ خود حاضر ہو کر سناؤں گا ورنہ Palace
یہ خط کبھی ختم نہ ہوگا۔

وینس کا شیشہ تو آپ جانتے ہیں دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس کے وہ وہ عجائبات
دیکھے کہ ان کے تصور سے آنکھیں اب تک خیرہ ہیں۔ دل کڑا کر کے وینس کو خیرباد کہا اور میلان
(Milan) آیا۔ یہاں کی چند عمارتوں کے علاوہ کوئی بات قابل بیان نہیں اور ان کے
ذکر سے میں اپنے خط کو خشک بنانا نہیں چاہتا۔ اور پھر اس کے بعد لوزان کی کوہستانی
دلنوازی اور سوئٹزرلینڈ کی دلفریب نعمائیہ سب قصے دہلی مسلم ہوٹل میں بیٹھ کر سنونگے
فرانس میں داخل ہوئے تو پیر سیا کی جگہ پاردوں میسور (Pardon Monsieur)
اور پاردان مدام (Pardon Madame) نے لے لی۔ فرانس میں یہ قاعدہ ہے کہ
جب دو آدمی ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے ہیں تو دونوں یہی فقرہ دہراتے ہیں۔

یورپ کی ٹرین Corridor Train ہوتی ہے سفر بہت لمبا تھا۔ اس لئے
اکثر لوگ ٹرین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آتے جاتے رہتے تھے۔ میں محض
شوقیہ ادھر سے ادھر تک چکر لگاتا تھا۔ بس سر نچا کئے 'چہرے پر مسکراہٹ'، پاردان میسؤ
پاردان مدام، پاردان میسؤ پاردان مدام کہتا ہوا نکل جاتا تھا۔ عجب لطف تھا۔ فرانس کے
لوگ ٹرین میں ہمسفر ہوں تو گو آپ ان کی زبان سے ناواقف ہوں اور انہیں اس بات
کا علم بھی ہو تاہم مرد ہو یا عورت۔ آپ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں گے اور کوئی نہ کوئی
بات شروع کر دیں گے۔ میرے ساتھ ایک مدام تھیں وہ فرانسیسی بولتی جاتی تھیں اور
مسکراتی جاتی تھیں۔ میں انگریزی بولتا جاتا تھا اور مسکراتا جاتا تھا۔ نہ میں ان کی بات
سمجھتا تھا۔ نہ وہ میری بات سمجھتی تھی۔ تاہم ایک رشتہ سا قائم ہو گیا تھا جو ہر نوع بہت

خوشگوار تھا.

اسی ٹرین میں انگریز آدمی دور سے ظاہر ہو جاتا تھا. پائپ منہ میں ٹھونسے ٹرین کے ایک کونے میں بیٹھا. ماتھے پہ تیوری چڑھائے ٹائمز کے اشتہاروں کا مطالعہ کر رہا آپ نے کسی موقع پر Excuse Me کہا تو انہوں نے اپنی بھنویں ذرا اونچی کیں. آپ کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر مطالعہ میں مصروف ہو گئے. خدا شاہد ہے کہ اطالیہ سوئٹیزرلینڈ اور فرانس دیکھنے کے بعد انگریز کو منہ لگانے کو دل نہیں چاہتا ریل میں یہ تھا کہ کوئی دوسرے کی قومیت سے واقف نہ تھا. اس لئے ایک پیر میاں دوسرا پارہ دان سمجھنے کی کوشش کرتا تھا. اور بعد میں معلوم ہوتا تھا دونوں انگریز ہیں. ریل میں دو نیوزی لینڈ کے باشندے (میاں بیوی) جو سوئٹیزرلینڈ کی سیاحت سے واپس آرہے تھے اور جو اپنے Honeymoon پر سب دنیا کا چکر لگا رہے تھے ان سے دوستی ہو گئی. وہ بھی آج کل لندن میں ہیں. یہاں ان کی اپنی موٹر کار ہے. آج شام کو انہوں نے مجھے کھانے اور سیر کی دعوت دی ہے. اغلباً تھیٹر لے جائیں گے. افریقہ سیلون، چین اور امریکہ دیکھ چکے ہیں. ہندوستان جانا فضول سمجھتے ہیں. فی الحال یورپ کی سیاحت کر رہے ہیں.

خیر میں داستان کو مختصر کروں. ہوتے ہوتے لندن پہنچا. لندن کی وسعت اور عظمت کی کہانیاں تم کئی سن چکے ہو. لیکن لندن مجھ جیسے آدمی کو موہ نہیں سکتا بھلا جہاں بازار میں لاکھوں موٹریں اور ٹرامیں اور بس گاڑیاں اور جانے کیا کیا بے تحاشا بھاگی جا رہی ہوں. وہاں دماغ کو فرصت نہیں ملتی. اور دل بے چارہ کس شمار میں ہے. دل میں ہوکیں تو جب اٹھتیں جب وینس ہو — ہائے وینس کی کیا بات ہے.

یہاں آتے ہی ضروریات سے فارغ ہو کر تھیٹروں کے اشتہار دیکھے. کام کی

Everymans Theatre میں Arms and the Man میں

رہا ہے۔ کمبخت دور بہت ہے لیکن بھلا ہم دیکھنے سے کیوں باز آنے لگے Old Voice میں King John ہو رہا ہے وہ بھی دیکھوں گا Philhormour میں Light of Asia ہو رہا ہے وہ رات دیکھ آیا ہوں بہت شان سے شروع ہوئی ہے اور دیکھنے کے قابل چیز ہے۔ ایکٹنگ تو خیر معمولی ہے دبے ہو وہ نہیں لیکن Atmosphere بہت فراست سے پیدا کیا گیا ہے۔ فلم تو آپ لاہور میں ضرور دیکھیں گے لیکن اللہ کرے جو موسیقی یہاں تھی وہ وہاں بھی ہو گوتم کی پیدائش میں انہوں نے یسوع مسیح کی پیدائش کا سا سٹیج پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اور اس دوران میں جو موسیقی بجتی ہے اس میں بھیروی کی بے شمار تانیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ اس میں آپ ذرا برابر بھی مبالغہ نہ سمجھیں اور یوں بھی آرکیسٹرا کے سارے پروگرام میں ہندوستانی راگوں کا رنگ نمایاں تھا ایک مقام پر گوتم کا باپ ایک خواب دیکھتا ہے۔ وہاں پر باقی آرکیسٹرا تو بالکل خاموش تھا صرف Cell (وہ طنبورے کی مانند بہت بڑا سا وائلن Violin ہوتا ہے) صرف اس کے تار کمان سے نہیں ہاتھ سے بجا رہے تھے۔ جس طرح ستار بجاتے ہیں۔ اس کی گمبھیر تھرتھراتی ہوئی سُریں بہت ہی موزوں معلوم ہوتی تھیں۔ ایک مقام پر کچھ ہنگامہ سا تھا۔ وہاں سب آرکیسٹرا بجانے والے اپنے گلے سے بھی سُریں نکالتے تھے۔ الفاظ نہ تھے محض الاپتے تھے یہ تصویریں جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں تماشے کے بعد مفت ملتی ہیں۔ طق کیا معنی وہاں ایک طاق میں رکھی ہیں جو چاہے جتنی چاہے اٹھا کرلے جائے۔ باقی سینما، تھیٹر وں دیغیرہ کے متعلق جو سوالات آپ کے دل میں اٹھیں وہ یا تو مجھ سے پوچھئے یا میرے آنے تک ملتوی رکھئے میں فی الحال لندن میں مقیم ہوں، چند دن کے بعد کیمبرج جاؤں گا۔

لندن میں ہندوستانی طلبا کی انجمن میں بھی گیا۔ حبِّ وطن کی خاطر! وہاں کا ممبر بھی بن گیا۔ لیکن وہاں کی فضا میرے لئے ناموافق ہے۔ بھلا جہاں طرح طرح کا نیٹو اپنی جبلی بدتمیزیوں پر ایک ہلکا سا انگریزی اخلاق کا غلاف چڑھائے فرعون بے سامان بنا پھر رہا

ہو وہاں بخاری کے پیٹ میں درد ہو یا نہ ہو؟ خیر دیسی بھائیوں کا ذکر ہی جانے دیجئے۔

مراز روز قیامت اگر غم است ازیست

کہ روئے مردم عالم دوبارہ باید دید

عدن اور پورٹ سعید میں بہت سا اسلامی درد لئے ہوئے داخل ہوا تھا اور حال یہ ہوا کہ محض اپنی شرافت کی وجہ سے ابھی تک مسلمان ہوں۔ ورنہ اسلام نعوذ باللہ ننگ معلوم ہوتا ہے (سالک صاحب کو یہ فقرہ نہ سنائیے)

میرا یہ خط احباب کو سنا دینا۔ جگل سے کہنا کہ ظالم تو وینس میں نہ ہوا ورنہ زندگی سپھل ہو جاتی۔ میرے پیارے دوست سالک کو میری طرف سے بہت بہت پیار کرنا (محاورہ کیا ہے؟ پیار لینا؟ لیکن "سالک کو پیار لینا" کچھ بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ "سالک سے پیار لینا" کچھ کاروباری معاملہ معلوم ہوتا ہے خیر)

میرے ذمّے منشی صاحب کے کچھ روپے نکلتے ہیں تین یا شاید چار۔ آتی دفعہ ان کے لئے چاکلیٹ کا ڈبہ خرید لاؤں گا۔ اور میں کیا کر سکتا ہوں۔ حفیظ صاحب کی نظمیں وینس میں بہت یاد آئیں۔ مثلاً کشتی میں سوار ہو کر میں "گنگوتری سے نکلی" گاتا رہا۔

قبلہ مولوی صاحب اور برادر محترم حمید علی صاحب کی خدمت میں میرا سلام عرض کر دیجئے۔ گردھاری بابو، رائے صاحب، اختر صاحب .... اور منشی ریشمین کو نیاز۔

حکیم یوسف حسن سے کہیئے نیرنگ خیال خدا کے لئے بھجواتے رہیں۔ نہ معلوم ابھی تک تہذیب کیوں نہیں ملا۔ حکیم احمد شجاع کو میرا سلام پہنچا دیجئے۔ اور کہیئے کہ یہاں لندن میں ایک ہندوستانی تھیٹر کی سخت ضرورت ہے کچھ اس کے متعلق بھی غور فرمائیں۔

تاثیرؔ صاحب کو سلام۔ باقی جو نثو خیر اسے اس سے کہیئے بخاری نے تمہیں سلام بھیجا ہے آئندہ سے میں ایک فہرست بنا کے رکھ چھوڑتا ہوں۔ اس کی ہزار دو ہزار کاپیاں چھپوا لوں گا۔ میرا پتہ یہ ہے

(۳)

امتیاز بھائی ! غالباً میں نے تمہیں آخری خط لندن سے لکھا۔ بجز اس ایک کارو باری خط کے جو کیمبرج سے اس کے بعد بھی بھیجا اس وقت دل کی کیفیت یہ تھی کہ انگلستان میں نو وارد تھا۔ ہر ایک چیز کو بظاہر متانت سے دیکھتا تھا لیکن اندر ہی اندر گنواروں کی مانند متحیّر اور بدحواس سا ہوتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں مرعوب کئے دیتی تھیں اور بسا اوقات انگریزوں کی اور خصوصاً کیمبرج کی روزمرہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ سیکھنے کا بیحد مشتاق تھا۔ لیکن کوئی سکھلانے والا نہ ملتا تھا۔ سوائے ان چند ہندوستانیوں کے جو پرانے واقف تھے اور جن کو انگلستان میں مقیم ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن ان کے روّیے میں ایک تصنّع، ایک رعونت، ایک سطحی پن، ایک کھوکھلا ہٹ" پائی جاتی تھی جس سے میں کوسوں دور بھاگتا ہوں۔

اب یہ حالت ہے کہ کیمبرج کے علمی، ادبی، معاشرتی مشاغل میں منہمک ہوں اور جس سہولت اور سلیقے سے میں نے یہاں کی زندگی اختیار کی ہے اس پر میں خود حیران ہوں۔ ہندوستانیوں سے رفتہ رفتہ قطع تعلق ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ آج کسی ہندوستانی سے بات کئے پندرہواں دن ہے۔ انگریز دوستوں کا حلقہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے اور گزر اوقات کا ایک خاص ڈھنگ بنتا چلا جا رہا ہے دل و دماغ نے اپنے لئے ایک معیار اختیار کر لیا ہے اور ہر سرگرمی اس معیار پر پوری اترنے کے لئے وقف ہے۔

جب میں کیمبرج پہنچا تو تمام کالج بند تھے۔ بازار بے رونق اور ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس عرصہ میں میں نے چھوٹی چھوٹی ضروریات بہم پہنچا لیں اور کیمبرج کے گرد و نواح سے خوب اچھی طرح واقف ہو گیا۔ جب کالج کھلے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دائیں بائیں اِدھر اُدھر ہر طرف ہزاروں دروازے یک لخت کھل گئے جن میں سے ہجوم کے ہجوم کالے کالے گون پہنے تمام شہر پر چھا گئے۔ نو وارد نئے نئے گون، سہما سہما چہرہ، نرالے

گم گم گون کیا کاٹے چیتھڑے چال بے پروائی. چہرے پر ایک تیقن، اساتذہ دنیا ومافیہا سے بے خبر اپنی دُھن میں چلے جارہے ہیں. یونیورسٹی نے سانس کیا لیا ایک چھینک ماری جس سے کیمرج بھر میں ایک لرزہ سا آگیا جیسے کسی گھڑی ساز کی دکان میں سب گھڑیاں یک لخت چلنے لگ جائیں. اس بھونچال میں میں بھی ایک طرف کو دبیے چلا جارہا تھا سینے میں ایک عجیب قسم کی دھڑکن تھی اور دل پر ایک اداسی چھائی ہوئی تھی. یا الٰہی اب کیا ہوگا. یہ تو دنیا ہی نرالی ہے اور میں بے یار و مددگار، نہ ہم سخن، نہ ہم خیال، گھر سے کوسوں دور، بجز اپنے دل کی تقویت کے کوئی سہارا نہیں. ہفتے کے ہفتے گھر سے خط آتا تو اپنی تنہائی کو اور بھی زیادہ محسوس کرنے لگ جاتا.

جب لیکچر شروع ہوئے تو اس مایوسی نے کشمکش کی صورت اختیار کرلی. وہ یوں کہ بعض لیکچروں میں تو قوئی میں ایک حرکت اور خیالات میں پرواز محسوس ہونے لگتی. اور بعض لیکچروں میں یہ حالت تھی کہ نوٹ بک کھولے بیٹھا ہوں. پنسل ہاتھ میں ہے. آنکھیں لیکچرار کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں. ماتھے پر تیوری ہے. ہمہ تن گوش ہوں. ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہا ہوں اور ہر فقرے کو دل میں دوہراتا ہوں. لیکن وقت گزر جاتا ہے اور دماغ کسی چیز پر قابو نہیں پاتا. کچھ لکھنے لگتا ہوں اور لکھ نہیں سکتا. خیالات میں ایک گونج سی ہے جس میں کچھ معنی نہیں ڈال سکتا. ایسے لیکچر کے خاتمے پر مجھ سا دل شکستہ دیگر انسان کیمرج میں نہ ہوتا ہوگا. اپنی کم مائیگی پر بے انتہا نادم، زندگی کے جو سال ہندوستان میں ضائع کئے ان کا بیحد افسوس دل میں غضبناک نئے نئے ارادے، نخوت علم کو شدید صدمہ، غصہ اور رنج، ولولہ اور امنگ سر جھکا ہوا. ایک نیم مردہ مایوس انسان آہستہ آہستہ قدم اٹھائے لائبریری کی طرف جا رہا ہے. یہ وہ انسان ہے جو ہندوستان جنت نشان میں انگریزی کا ماہر مفنی عمر میں لامحدود قابلیتوں کا مالک سمجھا جاتا تھا دھوکا، امتیاز سب دھوکا، اے میرے بچپن کے رفیق اے مایہ ناز ہم عصر! سب مایا.

نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ایک تپسوی کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اپنے آپ کو یونیورسٹی لائبریری کے ایک کونے میں گم کر دیا۔ اس فقرے کے صحیح معنی جب تمہاری سمجھ میں آئیں گے جب تمہیں یہ معلوم ہو گا کہ لندن کے عجائب خانہ کی لائبریری کی طرح یہاں کی لائبریری بھی ولایت میں جو کتاب چھپے اس کی ایک کاپی کی حقدار ہے۔ اس کتب خانے میں یوں ہاتھ پاؤں مارے جیسے مثلاً تم رودبار انگلستان کو تیر کر عبور کرنے کی کوشش کرو۔ غرضیکہ ایک بخار چڑھا ہوا تھا۔ ایک دیوانگی سی طاری تھی۔ چاہتا تھا کہ چاسر سے لے کر ٹامس ہارڈی تک شعر و سخن کی تمام دنیا پر ایک بجلی سی چمکے اور روشن تصویر پوری کی پوری ایک لمحے کے اندر میرے دل پر نقش ہو جائے لیکن یہ کیونکر ممکن تھا۔ چنانچہ دیوانگی نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی۔ کیمبرج کے طوفان نے میرے قدم کہیں بھی نہ جمنے دیئے اور علوم و فن کے اس سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

اس کے بعد مجھے کیا پیش آیا؟ اس کے متعلق مجھے یہاں کے طریقۂ تعلیم کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھنا پڑے گا۔

یہاں کے کالجوں کی تعداد چودہ پندرہ کے قریب ہے۔ ہر کالج کا انگریزی لکچرار لٹریچر کے ایک خاص موضوع پر لکچر دیتا ہے۔ اکثر ہفتہ میں ایک دفعہ اور بعض اوقات ہفتہ میں دو دفعہ۔

بعض کالجوں میں انگریزی کے دو تین لکچرار ہیں اور بعض ایک سے زیادہ موضوع پر لکچر دیتے ہیں۔ اس طرح انگریزی لٹریچر کے یونیورسٹی بھر میں ایک ہفتہ کے اندر تیس پینتیس لیکچر ہوتے ہیں ہر کالج میں ایک لکچرار انگریزی کا انچارج ہوتا ہے جس کو ڈائریکٹر یا اوورسیر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

ٹرم کے شروع میں باری باری ہر طالب علم اپنے کالج کے اوورسیر کے پاس جاتا ہے۔ ہماری باری بھی آئی۔ گون پہنے ہوئے شام کے چھ بجے اوورسیر کے کمرے کے پاس پہنچے

ہوئے پہنچے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی۔ ایک نہایت نرم آواز نے "کم ان" کہا۔ اندر داخل ہوئے تو اپنے آپ کو کتابوں کی الماریوں میں گھرا ہوا پایا۔ ایک صوفہ پر مسٹر بینیٹ (Bennet) دراز تھے۔ مسٹر بینیٹ شیکسپیئر اور چاسر کے ماہر ہیں۔ اور چاسر کے زمانہ پر ایک قابل قدر تصنیف The Pastors Etc. کے مالک ہیں معمولی اخلاق کے بعد انہوں نے ہمدردانہ سوالات پوچھنے شروع کر دیئے۔ گفتگو نہایت ہلکی تبسّم آمیز قسم کی اور زیادہ تر ہندوستان۔ اردو لٹریچر، افغانستان، سوراجیہ پارٹی، عمر خیام، الف لیلے پنجاب یونیورسٹی، اقبال، ٹیگور، برنارڈ شا، کپلنگ اور حیدر آباد کے متعلق تھی۔ اور چونکہ ہم بھی آخر بڑی سے بڑی مجلسوں سے نکالے گئے ہیں اس لئے تمہیدی ہچکچاہٹ کے بعد ہم نے بھی دل کھول کر بکنا شروع کیا۔ گو بسا اوقات داستان کو زینت دینے کے لئے حقیقت سے ذرا انحراف بھی کیا۔ محض حب وطن کی خاطر، لیکن عام لہجہ ایک راست گو حق پرست انسان کا تھا جو اپنی قوم کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہے، جو باوجود قوم انگلش کے گوناگوں اوصاف سے باخبر ہونے کے انہیں ایشیائی تہذیب کے لئے کچھ مضر ہی سمجھتا ہے اور جو اب تحصیل علم کی خاطر یہاں کے مشاہیر کے قدموں میں بیٹھنے کے باعث صد فخر و ناز تصور کرتا ہے۔

جناب کچھ مسکرائے۔ ایشیائی تہذیب اور تاریخ اسلام سے بہت دلچسپی ظاہر کی۔ میرے انگریزی تلفظ کی بہت تعریف کی اور مجھ سے یوں باتیں کرنے لگے جیسے میں الف لیلے کا کوئی کیریکٹر ہوں۔ لیکن افسوس کہ تھوڑی دیر بعد گفتگو نے انگریزی لٹریچر کی طرف رجوع کیا۔ ہم نے اپنے عجز اور کم مائگی کا اعتراف کیا۔ اپنی نالائقی کو کوسا۔ اپنی جہالت کے متعلق ایک بلیغ تقریر کی اور جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا علاج کیا ہے۔

جو کچھ انہوں نے جواب میں کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ تم بالکل چغد ہو۔ اگر تم یہ توقع کرتے ہو کہ تمہیں ہر لیکچر سمجھ میں آجائے تو تم غلطی پر ہو۔ ڈاکٹر لیوس (Lewis) کے لیکچر جن

کے متعلق تم شاکی ہو وہ کیمبرج میں کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتے۔ اور کوئی بھی اسقدر گدھا نہیں ہوتا کہ چاسر سے لے کر ہارڈی تک سب انگریزی لٹریچر کی ایک گولی بنا کر نگل جانا چاہے۔ جو مصنف تمہیں پسند ہیں۔ جن جن کی تصنیفات تمہارے دل و دماغ میں ایک خوشگوار ہیجان پیدا کرتی ہیں صرف وہی پڑھو۔ صرف انہی کے متعلق لکچروں میں جاؤ۔ باقی بالکل چھوڑ دو۔ چنانچہ یہ رہی لکچروں کی فہرست۔ فلاں فلاں لکچروں میں جاؤ۔ ان کے متعلق اس ہفتے صرف یہ دو کتابیں پڑھو۔ اگلے ہفتے اور اس کے بعد ہر ہفتے مجھ سے اسی وقت ملو۔ جو دقت تمہیں پیش آئے بلا تامل دن اور رات کسی وقت مجھ سے مل کر بیان کرو۔ یہ کتابیں مجھ سے مستعار لے جاؤ۔ پرسوں اگر میرے ساتھ چائے پیو میری بیوی تم سے مل کر بہت خوش ہوگی رہتے کہاں ہو؟ میں کسی وقت آکر تم سے ملوں گا۔ جب لندن میں پروفیسر جونز سے ملو تو بعد میں مجھے آکر ملاقات کا مفصل حال سنانا۔ کوئی کھیل کھیلتے ہو؟ نہیں کوئی اور شغل؟ ڈرامہ، موسیقی! خوب کبھی ہمیں بھی گانا سنانا۔ تمہارے ڈنر کا وقت قریب آرہا ہے۔ میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں اور حیران ہوں کہ تم لوگ ہندوستان میں رہ کر اتنی انگریزی کیونکر سیکھ لیتے ہو۔ تمہارے دستانے کہاں ہیں؟ رستہ تو نہیں بھول جاؤ گے؟ میں تمہارے ساتھ چلوں؟ نہیں! اچھا خدا حافظ خوش رہا کرو اور جب تمہیں کسی قسم کی تکلیف ہو فوراً میرے پاس آجایا کرو۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور واپسی میں تمام راستے مسکراتا آیا۔

پھر تو ہمارے حوصلے بڑھنے لگے اور جوں جوں دن گزرتے گئے۔ زندگی خوشگوار تر ہوتی گئی۔ آج اس نے چائے پر بلایا۔ کل اس نے کافی کی دعوت دی۔ واقفیت سے دوستی اور دوستی سے بے تکلفی کی نوبت آگئی ایک آدھ حضرت سے محبت وصول وچھے کی سی حد تک بڑھ گئی ہے۔

لیکن وہ ہندوستان کی صحبتیں کہاں، وہ خوش گفتاری، وہ شعر بازی، وہ پھبتیاں

وہ رودھنا، وہ مناتا۔ وقت اپنے گھر کا غلام، موقع ومحل خانہ زاد، وہ ہوٹل کی مجلسیں، وہ دارالاشاعت کے مجمعے، ہائے امتیاز! ایک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے۔ پیارے جنگل کی خوش فعلیاں، ننھے منشی کی چہلیں، میرے سالک کی مذہبی لن ترانیاں (اللہ دودھوں نہلائے اور پوتوں پھلے) وہ حفیظ کی ٹھمریاں (اللہ کی امان)

خیر ان باتوں کو دو سال کے لئے بھلانا پڑے گا۔ اب تو زندگی کا یہ ڈھنگ ہے کہ کالج کے ہاسٹل میں دو کمرے ملے ہوئے ہیں۔ ایک بیٹھنے کو۔ ایک سونے کو۔ باقی جگہوں میں صرف رات کا کھانا اکٹھا کھایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاسٹل میں یہ دستور ہے کہ ہاسٹل کے رہنے والے جن کی تعداد تیس کے قریب ہے۔ ناشتہ اور لنچ کامن روم میں اکٹھے کھاتے ہیں۔ اور شام کو کھانا سب کالج کے طلباء اور اساتذہ کے ساتھ کالج کے ہال میں ہوتا ہے چائے کا اکثر یہ حال ہے کہ یا میں کہیں مدعو ہوں یا کوئی میرے ہاں آیا ہوا ہے۔

صبح کے وقت ڈریسنگ گون، پاجامہ، سلیپر اور تولئے غسل خانے سے آتے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غسل خانے کے اندر سب ننگے ہو کر بغیر کسی شرم وحیا کے ایک دوسرے کے سامنے نہاتے ہیں۔ پھر کامن روم میں حاضری، نو بجے کے بعد سب گون پہنے ہوئے پیدل اور بائیسکلوں پر بھاگتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر بائیسکل کے ہینڈل کے ساتھ ایک ٹوکری لگی ہوتی ہے جس میں کتابیں وغیرہ ڈال لیتے ہیں۔ نو بجے سے ایک بجے تک لکچروں کے اوقات ہوتے ہیں۔ اس دوران میں کیمبرج کا نظارہ تین عناصر سے مرکب ہوتا ہے (۱) گون (۲) نوٹ بک اور (۳) جلدی۔ دس بجے ایک لکچر اس کالج میں ختم ہوا۔ اور دس ہی بجے دوسرا لکچر دوسرے کالج میں شروع ہونے والا ہے۔ چنانچہ بسا اوقات بازاروں میں سے بے تحاشا بھاگتے ہوئے جانا پڑتا ہے۔ لکچرار قسم قسم کے ہیں ایک مسٹر بنیٹ ہیں، ادھیڑ عمر۔ جوانی میں بہت ہی خوبصورت ہوں گے۔ شکسپیر اور زمانہ وسطیٰ

کے لٹریچر پر لیکچر دیتے ہیں، اس انہماک، اس جوش، اس فصاحت، اس بلاغت کے ساتھ کہ اکثر کلاس دو دو منٹ تک داد دیتی رہتی ہے (جس کا طریقہ یہ ہے کہ فرش پر زور زور سے پاؤں مارتے ہیں)۔ ایک مسٹر ٹل یارڈ (Till Yard) ہیں فرماتے ہیں اور اس کے علاوہ تاریخ تنقید پر بھی لیکچر دیتے ہیں لیکن جس موضوع پر بولتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر اسی میں صرف کردی۔ ایک مسٹر لوکس (Lucos) ہیں چھپے دار فقرے۔ اعلیٰ درجہ کا تفنن، غضب کی تشبیہیں، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ان پر ختم ہے مگر مطلب کی بات بہت کم کہتے ہیں۔ اس لئے گوڈ کا ٹیمی سن پر لیکچر دیتے ہیں۔ لیکن میں نے ان کے مضمون کا ذکر نہیں کیا ایک ڈاکٹر لیوس (Leowis) ہیں۔ نوجوان لیکن D.L.L.D. کی ڈگری کے مالک دورِ جدید ان کا خاص مضمون ہے تمام تنقید کی بنیاد دقیق نفسیات پر رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے موجودہ مصنفوں کے بخیے ادھیڑتے ہیں (ان بے چاری ولکاکس بھی شامل ہے) لیکن اپنے موضوع میں اس قدر ڈوبے ہوتے ہیں کہ ہنسی مذاق کی بات ان کے ہونٹوں پر آتی ہی نہیں۔ جو شخص ان کے لیکچر میں دو فقرے بھی اچھی طرح سمجھ لے۔ یقینی امر ہے کہ دو تین سال کے بعد انگلستان کے بہترین نقادوں میں شمار ہوگا۔ لیکن ہائے وہ دو فقرے!

میں ان کے پاس بھی دو دفعہ اپنا جواب مضمون دکھلانے جاتا ہوں۔ بے چارے میرے ساتھ بہت محبت کرتے ہیں۔ لیکن جس بلندی پر وہ اڑتے ہیں اور جس زمین پر میں رینگتا ہوں ان میں فاصلہ اس قدر ہے کہ میرا ان کے برابر اڑنا شاید کبھی ممکن ہو لیکن ان کا مجھ تک اترنا قطعی ناممکن۔ لہٰذا گو ان سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہوں۔ بہت کچھ۔ لیکن ہر دفعہ اپنی بے بضاعتی کا از حد تیز احساس اپنے ساتھ لاتا ہوں۔ جو بہت دیر تک برہم کئے رکھتا ہے۔

اور ان سب سے بڑھ کر پروفیسر آرتھر کولرکوچ (Arthur Quiller Couch) ان کے نام سے تو تم واقف ہو گے۔ اگر نہیں تو تمہاری جہالت کی نشانی ہے کیمبرج میں ہر کہ و مہ ان کو کیو Q کے نام سے پکارتا ہے۔ نظر کی خرابی کی وجہ سے باہر کم نکلتے

ہیں ادھر باقاعدہ لیکچر بھی نہیں دیتے۔ صرف ہفتے میں ایک بار کلاس لیتے ہیں۔ بدھ کے دن شام کے ساڑھے آٹھ بجے ان کی کلاس ہوتی ہے، جس میں ہم پچاس ساٹھ آدمیوں کو ارسطو کی Poetics پڑھاتے ہیں۔ کلاس کا حال سن لو۔ ایک اوسط درجے کا کمرہ ہے۔ فرش نہایت ہی عمدہ، بیس پچیس کرسیاں۔ انگیٹھی میں آگ خوب جل رہی ہے۔ بیچ میں ایک بڑی میز ہے جس پر پچاس ساٹھ پرزح پیالے پڑے ہیں۔ سوا آٹھ بجے سے لوگ جمع ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ جو پہلے آتے ہیں وہ کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں باقی فرش پر آلتی پالتی مار کر یا نیم دراز۔

ساڑھے آٹھ بجے دروازہ کھلتا ہے اور آپ داخل ہوتے ہیں۔ سر اور مختصر سی مونچھوں کے بال سفید، خمیدہ قامت۔ ہاتھ میں سگار لئے ہوئے۔ چہرہ پر مسکراہٹ۔ مسکراہٹ بھی شرابیوں کی سی، اور فی الواقع پیتے بھی بہت ہیں۔ سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی لیکچروں میں کھڑے ہونے کا دستور نہیں Q کے پیچھے پیچھے ایک ملازم طشت میں کافی لئے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ سب لوگ میز کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک کافی کا پیالہ اٹھا کر اپنی نشست پر جا بیٹھتا ہے اور سگریٹ یا پائپ سلگا لیتا ہے۔ پروفیسر صاحب کسی طالب علم کو لیکچر پڑھنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ وہ ایک آدھ پیراگراف پڑھتا ہے اور پھر Q صاحب اس پر بحث کرتے ہیں جس میں دنیا جہاں کی باتیں بیان کر جاتے ہیں۔ بعض دفعہ خوب زوروں کی بحث بھی ہوتی ہے۔ کلاس کیا ہے۔ مذاق اور متانت۔ علم اور دل لگی کی ایک ضیافت ہے جس سے دل کبھی سیر نہیں ہوتا خود پروفیسر کیو کی شخصیت کا میں تمہیں اس سے بہتر اندازہ نہیں دے سکتا کہ ان کی ترکیب طبیعت کا نسخہ ان الفاظ میں لکھو کہ شبلیؔ، غالبؔ، حالیؔ، آزادؔ اور اودھ پنچ کو ملا کر اس کی انگریزی بنا دو اور سو سے ضرب دے دو۔ انگریزی پڑھانے والوں میں سے لٹریچر کے شعبے میں صرف یہی ایک بزرگ ہیں جو پروفیسر کے لقب سے ملقب ہیں۔ لہٰذا تم ان کے تبحر کا اندازہ خود ہی لگا لو۔

دوپہر کے ایک بجے لیکچر ختم ہوتے ہیں اس کے بعد دو بجے تک لنچ اور دو سے چار بجے

تک تمام طلبا ایک نہ ایک کھیل کھیلنے جاتے ہیں۔ چار بجے شام ہو جاتی ہے۔ اور اندھیرا چھا جاتا ہے۔ چراغ روشن کر دیئے جاتے ہیں۔ آگ جلائی جاتی ہے اور اس پر چائے کیلئے پانی رکھ دیا جاتا ہے۔ چائے کے بعد ہال تک (یہاں کی اصطلاح میں ہال شام کے کھانے کو کہتے ہیں) چاہو تو ایک آدھ گھنٹہ مطالعہ کرو، چاہو تو کسی کا وقت ضائع کرآؤ۔ ہال کے بعد کافی کے لئے آگ پر پانی رکھ دو اور جب تک دل چاہے پڑھتے رہو۔ جو آئے اسے بے تکلف کان سے پکڑ کر باہر نکال دو۔ اور اگر بہت ہی بدتمیز دوستوں سے واسطہ پڑا ہے تو دروازہ کو اندر سے تالا لگا کر بیٹھو (یہ فعل گوناگوں شبہات کا باعث ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اپنے دوستوں کو اس کے صحیح معنی سمجھنے کی عادت ڈالو۔)

یہ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ابتدا میں یہ سب کالج راہب خانے تھے۔ چنانچہ یہاں کی زندگی میں مذہبی رنگ بہت نمایاں ہے۔ ہر کالج سے متعلق ایک گرجا ہے اور اس کے علاوہ شہر میں اور بھی بہت سے گرجے ہیں جن کے گھنٹے یہاں کی فضا کو ہر وقت مسیحیت میں لبائے رکھتے ہیں ہر ہفتے یونیورسٹی کے کسی نہ کسی گرجے میں ایک نہ ایک مشہور پادری یا واعظ یا مبلغ کا لیکچر ہوتا ہے۔ کیمبرج کا شہر بہت چھوٹا سا ہے۔ اور یہاں کی آبادی خاص طور پر دو حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ لوگ جو یونیورسٹی سے متعلق ہیں اور تعطیلات کے شروع ہوتے ہی یک لخت غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کو Gown Man کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ جس قدر شہر کے اصل باشندے ہیں وہ سب کے سب دکاندار یا مزدور پیشہ ہیں۔ ان کو Towns Man اور طلباء کی اصطلاح میں ٹاؤنی کہا جاتا ہے یہ سب لوگ نچلے طبقے کے ہوتے ہیں۔ کیمبرج میں کالج کی حدود کے باہر شر کا رمفقود ہیں۔

انڈر گریڈ (Under Grade) لوگوں کا یہ حال ہے کہ اگر چھاجوں پانی برس رہا ہو تو خیر ورنہ ٹوپی پہننا گناہ سمجھتے ہیں پٹی کا کوٹ اور فلالین کی پتلون یہ ان کا لباس ہے۔ پتلون پر یہ بڑے بڑے سیاہی کے داغ۔ گون کی بے عزتی کرنا فخر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جان بوجھ کر اس میں

جا بجا سوراخ کرتے ہیں اس سے یہ بھی مقصود ہوتا ہے کہ نووارد معلوم نہ ہوں۔ ان کے مشاغل کی کثرت کا کچھ نہ پوچھو۔ قسم قسم کے جنون ہیں۔ پڑھتے ہیں، کھیلتے ہیں، سفر و سیاحت کی ایک کلب بنا لیتے ہیں جس میں جنوبی افریقہ تک ہو آتے ہیں۔ مچھلیاں پکڑتے، گولف کھیلتے ہیں، کشتیاں چلاتے ہیں۔ طرح طرح کے ساز بجاتے ہیں۔ ناچتے ہیں، گرجاؤں میں تبلیغ کا کام سیکھتے ہیں، تصویر کشی کرتے ہیں۔ بعض رؤسا بہت اعلیٰ درجے کی پوشاک پہنتے ہیں۔ بعض کسی سیاسی کلب کے ممبر ہیں، جہاں ہمیشہ کسی نہ کسی سیاسی لیڈر کے لیکچر ہوتے رہتے ہیں۔ بعض ایک پیانو کرایہ پر لے آتے ہیں۔ بعض نے دو موٹر کاریں رکھی ہوئی ہیں اور کسی موٹر کار کلب کے ممبر ہیں جس کے نمائندے دنیا کی ہر بڑی سڑک پر مل جاتے ہیں۔ بعض کی زندگی گھوڑ دوڑ کے لئے وقف ہے بعض صبح سے شام تک لیباریٹری میں بھاڑ جھونکتے ہیں۔ ڈرامیٹک کلبیں بے شمار ہیں بعض صرف اوپیرا اور میوزیکل کامیڈی کرتے ہیں، بعض صرف یونانی کھیل، بعض سیدھی سادی کامیڈی، سینری، ڈریسیں وغیرہ سب خود بناتے ہیں۔ یا کم از کم وضع کرتے ہیں، غرضیکہ ایک تعلیمی میلہ ہے جس میں جو کام ہوتا ہے آئین کے ساتھ۔ انہماک و انضباط یہ یہاں کے دو بڑے اصول ہیں اور ان سب کی تہہ میں وہ حیرت انگیز طاقت کام کر رہی ہے جس کو Tradition کہتے ہیں۔ ہفتہ بھر پسینے بہا دینے والی مصروفیت میں گزرتا ہے۔ دن کو بھاگتی ہوئی ٹانگیں رات کو بند کمرے، روشن چراغ اور کھلی ہوئی کتابیں، اتوار کے دن کیمبرج کی سب آبادی سب مصروفیت، سب چہل پہل خدا جانے کہاں غائب ہو جاتی ہیں۔ امتیاز! یہاں کی اتوار ایک معجزہ ہے۔ دن کے گیارہ بجے میلوں گھوم جاؤ۔ ایک درجن سے زیادہ آدمی نہ پاؤ گے وہ بھی سیاہ پوش، سست رفتار، سوائے گرجاؤں کے گھنٹوں کے اور زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے، بازاروں کو دیکھو تو ہو کا عالم، آہیں بھرنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔ شام کے وقت دن کی کسر پوری کر دی جاتی ہے اور مرد و زن کے جوڑے ہزاروں کی تعداد میں چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اکثر قبل از دواج کے مراحل طے کرنے مصروف ہوتے ہیں

اور یہ وہ شغل ہے جو انگلستان میں شادی سے پہلے بھی جائز ہے۔ اور شادی کے بعد بھی شادی کا ارادہ نہ ہو جب بھی۔ حق تو یہ ہے کہ اسے شادی سے کچھ چنداں تعلق نہیں۔ اور چونکہ کیمبرج کے لوگ تمام تر نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اس کے قبیح ترین پہلو بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔

کیمبرج آکسفورڈ کی بہ نسبت بہت زیادہ قدامت پرست ہے۔ چنانچہ گو یہاں لڑکیوں کے دو کالج ہیں لیکن وہاں کی طالبات نہ تو یونیورسٹی کی ممبر شمار کی جاتی ہیں نہ کسی ڈگری کی حقدار البتہ لیکچروں میں آتی ہیں اور امتحانوں میں بیٹھ سکتی ہیں لیکن امتحان پاس کرنے کے بعد ان کو ڈگری نہیں ملتی۔ باوجود اس کے انگریزی کی کلاس میں پچاس ساٹھ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ اگر اتفاق سے لیکچر میں کوئی ساتھ بیٹھ جائے تو شامت آ جاتی ہے۔ ہم لوگ ایک نوٹ بک کھول کر نوٹ لینا شروع کر دیتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ میز کا ایک مربع فٹ استعمال کرتے ہیں۔ وہ پہلے تو گلے سے لومڑی کی دُم کھول کر میز پر رکھتی ہیں پھر دستانے اتار کر رکھتی ہیں۔ پھر کوٹ اتار کر بنچ کی پشت پر پھیلاتی ہیں۔ دستانوں کے پاس ٹوپی اتار کر رکھ دیتی ہیں۔ پھر ہینڈ بیگ کھول کر اس میں سے پنسل اور رومال نکالتی ہیں۔ رومال سے ناک پونچھتی ہیں۔ ہینڈ بیگ کے چھوٹے سے آئینہ میں اپنے چہرے کا جائزہ لیتی ہیں کنپٹی پر سے زلفوں کے گھنگھر سنوارتی ہیں۔ پھر کچھ جھک کر کہنی کو پڑوسی کی ناک میں دے کر بہت خوبصورتی اور سلیقے سے نوٹ لینا شروع کر دیتی ہیں۔ دو منٹ کے بعد ان کے قلم میں سیاہی ختم ہو جاتی ہے۔ طوعاً و کرہاً آپ اپنا قلم یا پنسل پیش کیجئے اور خود گھنٹہ بھر مکھیاں مارتے رہیئے۔ ایک ایسے تلخ تجربے کے بعد اب میں ایک فالتو پنسل ضرور رکھتا ہوں۔

یہ حضرت کیمبرج یونیورسٹی ہے یہاں کا ہر فرسودہ پتھر تاریخ انگلش کی ایک خاموش فصیل ہے۔ یہ وہ دار العلوم ہے جہاں ہم سے کہیں پہلے جان ہارورڈ جس نے امریکہ میں

ہارورڈ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی) آلیور کرام ویل (Oliver Cromwell) سٹرن (Sterne) کولوج سیموئیل - بٹلر ـ بیکن - ٹینی سن - تھیکرے - میکالے - نیوٹن - بل ورلیٹن - سیلے - لارڈ چیسٹر فیلڈ - مارلو - ولیم پٹ - گرے اور ملٹن کسب فیض کر چکے ہیں - اور جہاں انگلستان کی آئندہ نسل کے کئی مشاہیر اس وقت تعلیم حاصل کر رہے ہیں - اس بہارستان میں ہندوستان کا ایک مرجھایا ہوا ایک بے رنگ پھول کیا حقیقت رکھتا ہے - غریب ماں باپ کا بیٹا - ایک غلام قوم کا فرد - نسیم اور مرزا شوق کی مثنویوں کا پڑھنے والا - فسانۂ آزاد کا دلدادہ - طبلے اور سارنگی کا شوقین - "زمیندار اور گرو گھنٹال" کا خریدار - ایشیا کے عشقیہ افسانوں میں رچا ہوا - مغلیہ عیش و عشرت کا خواہشمند - اتحاد اسلامی کے خواب دیکھنے والا" یہ بھلا کیا حقیقت رکھتا ہوں - خدا آبرو سے رکھے اور آبرو سے وطن کو واپس لے جائے - آپ میرے لئے یہی دعا کیجئے -

دو سال بعد " میرے مولا بلا لے مدینے مجھے " (گا کر)

اس دوران میں ایک دو دفعہ لندن بھی گیا - گلیڈس کوپر اور جیرالڈ ...... کو ایکٹ کرتے دیکھا - لیکن تھیٹروں کے متعلق پھر کسی خط میں لکھوں گا - ایک دن پورا فرتھ کے ساتھ گذارا اور ان کی معیت میں پروفیسر جونز اور یونیورسٹی کالج کے اساتذہ سے دن بھر اردو پشتو اور پنجابی کی اصوات کے متعلق نہایت تپاک سے ملا - انہوں نے میرے حروف تہجی کو سراہا - میں نے ان کی قرأت کو مرحبا کہا - بعض اصوات کے متعلق کچھ تیز بحث ہوئی کہ حلق کے کون سے کونے میں سے نکلتی ہیں - ہوتے ہوتے ہاتھا پائی کی نوبت آنے لگی - لیکن بعد میں صلح صفائی ہو گئی -

---

ایک دن لندن سے ہاشمی کا خط آیا - " ارے تم ! " " ارے میں ؟ " " اوہ " اس قسم کے جذبات کے اظہار کے بعد جناب نے فرما رکھا تھا کہ کسی دن شام کے سات بجے

کے بعد فلاں پتہ پر ہم سے آکر ملو۔ حضرت یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ میں لندن میں ہوں (خط میرے بینکروں کی معرفت بھیجا تھا) ہم نے انہیں جواب میں لکھا بڑے خبطی ہوا ہے۔ ہم جیسے شرفاء کو لندن سے کیا واسطہ۔ ارے ہم کیمبرج میں ہیں۔ کیمبرج میں یہاں آکے ہم سے ملو۔ چنانچہ —— ایک دن شام کے تین بجے کے قریب آپ وارد ہوئے۔ "ارے یار بخاری" "ارے یار ہاشمی" قصہ چہار درویش کے ڈھنگ پر بغل گیر ہوئے۔ اور شام تک بغیر ایک دوسرے کی بات سننے کے دونوں ایک ساتھ بکتے چلے گئے کبھی گانے لگ جاتے کبھی شعر پڑھنے لگ جاتے غرضیکہ عجب ہنگامہ رہا۔ عجب عجب قہقہے دہرائے گئے ہندوستان کی حالتِ زار پر بہت افسوس کیا گیا اور آپ سب لوگوں پر جو انگلستان آنے سے محروم ہیں لعنت و نفرین کے ووٹ پاس کئے گئے۔ شام کی گاڑی سے وہ لندن چلے گئے۔ اور دوبارہ آنے کا وعدہ کرتے گئے۔ تم پوچھو گے ہاشمی کا کیا حال ہے! بس بالکل وہی چیز ہے بالکل وہی۔

ایک ہفتے کی ڈاک میں تمہارا خط، ہریش کا خط، زبیدہ کا خط، بچوں کی تصویریں سب ایک ساتھ ملیں۔ یعنی ہندوستان میں مجھے جو کچھ محبوب ترین اور عزیز ترین ہے وہ یک لخت چھت پھاڑ کر میرے سر پر آگرا، جگل کے خط کا بہت بہت شکریہ۔ انکی غزل نے مجھے گھنٹوں مست رکھا جگل میرے بھائی اور حفیظ میرے بھائی اور امتیاز میرے بھائی اور سالک میرے بھائی خط ضرور لکھتے رہا کرو۔ تم سب لوگ باری باری بھی خط لکھو تو ہر ہفتے مجھے اپنے احباب کی ایک جیتی جاگتی تصویر مل جایا کرے اور تم میں سے ہر ایک کو مہینے میں ایک دفعہ خط لکھنا پڑے اور میرے بھائیو تم خود ہی سوچو کہ مجھے ہر ہفتے ایک خط والد کو، ایک خط ڈپٹی صاحب کو، ایک خط اپنی رفیق حیات کو، ایک رفعت صاحبہ کو لکھنا ہوتا ہے۔ اے میرے بھائیو! میں تم میں سے ہر ایک کو ہر ہفتے کیسے خط لکھ

سکتا ہوں۔ (میری آواز اس وقت بھرّائی ہوئی ہے)۔ لہٰذا اے میرے بھائیو! اسلامی اخوّت کا ثبوت دو اور خط لکھو۔

میں نے اس اپیل کو بہت رقت انگیز بنانے کی کوشش کی ہے لیکن مجھے شبہ ہے کہ دارالاشاعت میں اس کی ہنسی اڑائی جائے گی۔ اور میرے جذبات کو غائبانہ مجروح کرنے کی از حد سعی کی جائے گی۔ فلک حقّہ باز کو کیا کہوں؟

سالک صاحب! استاذی و محبّی! خدا کے لئے خط لکھو۔ جگل کے خط نے تڑپا دیا۔ خدا اسے خوش رکھے۔

خاکسار بخاری
عمانوئیل کالج کیمبرج

۲۵ نومبر ۱۹۲۶ء

میکسیکو کے کوچہ و بازار

پروفیسر احمد شاہ بخاری جب ۱۹۴۹ء کی پہلی عالمگیر ریڈیو کانفرنس میکسیکو میں پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے تشریف لے گئے تو آنریبل خواجہ شہاب الدین وزیر داخلہ کے نام حسب ذیل خط بھیجا۔

مکرمی و شفقی، سلام مسنون

ڈان کے ایک تازہ نمبر میں یہ خبر پڑھ کر طبیعت خوش ہوئی کہ کراچی میں بازاروں اور سڑکوں کے نام مشاہیر قوم کے نام پر رکھے جائیں گے۔ اس سلسلے میں میکسیکو کے بعض طور طریقے انوکھے ہیں اور دلچسپ بھی۔ ان کا مختصر حال لکھ بھیجتا ہوں۔ ممکن ہے کوئی بات آپ کے کام کی نکل آئے۔

جہاں تک مجھے نظر آیا، یہاں کسی بازار یا سڑک کا نام کسی زندہ شخص سے منسوب نہیں ہمارے لاہور کی طرح نہیں کہ جو شخص دو تین سال کے لئے میونسپل کمشنر ہوا۔ وہ کسی نہ کسی سڑک کو اپنے نام سے مزین کر گیا۔ چنانچہ لاہور میں کئی سڑکوں اور محلوں کے نام اب ایسے ہیں کہ کسی کو یاد بھی نہیں کہ کن کے نام منسوب ہوئے تھے اور اگر وہ اب تک زندہ ہیں تو کب کے گمنام یا بدنام ہو چکے ہیں۔ میکسیکو کی تاریخ یہ ہے کہ تین سو سال تک یہاں ہسپانوی

حکمران رہے اور لوگوں کا خون چوسا۔ ۱۸۲۰ء کے لگ بھگ اس ملک نے بزور شمشیر آزادی حاصل کی۔ اس کے تقریبًا سو سو سال تک خانہ جنگی رہی جس میں بڑے بڑے لٹیرے اور بڑے بڑے اولوالعزم محب وطن دونوں قسم کے لوگ پیدا ہوئے ۱۹۱۰ء میں ایک انقلاب عظیم ڈکٹیٹری کے خلاف برپا ہوا۔ جو کئی سال تک رہا اور جس میں میکسیکو کے بیشتر ڈکور مارے گئے۔ اس سو دو سو سال کی تاریخ میں کئی محبان وطن اور مشاہیر قوم بروئے کار آئے اور اکثر قوم کی راہ میں شہید ہوئے یعنی قوم کے دشمنوں یا غداروں یا کوتاہ نظر لوگوں اور اہل ہوس کی گولی یا تلوار کا نشانہ بنے۔ ان سب کے نام آج بازاروں کی زینت ہیں۔ محض ناموں ہی سے میکسیکو کے قومی عروج کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے تین نام تو بالخصوص جابجا ملتے ہیں ایدالگو Hidalgo موریلاس (Morelos) جوارز' ان میں سے دو مشاہیر نے ۱۸۱۰ء میں ہسپانیہ کے خلاف علم آزادی بلند کیا تھا۔ تیسرا انیسویں صدی کے وسط میں میکسیکو کا پریذیڈنٹ تھا اس نے نیا کانسٹی ٹیوشن ۱۸۵۷ء میں بنایا تھا اور کئی اصلاحات مرتب کی تھیں اس کے علاوہ ہر شہید پریذیڈنٹ کا نام کسی نہ کسی بازار پر ثبت ہے' اس کے علاوہ ایک اور ادا ان کی مجھے بہت پسند آئی۔ وہ یہ کہ کئی بازاروں کے نام داستانِ قوم کی اہم تاریخوں سے منسوب ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پیرس میں بھی ایک مشہور بازار کا نام "۴ ستمبر" ہے۔ یہاں یہ رسم عام ہے۔ ہر بڑے شہر میں ایک نہ ایک بازار کا نام "۵ مئی" ضرور ہوگا۔ اس تاریخ کو میکسیکو کی حکومت نے فرانسیسیوں کو شکست دی تھی۔ ایدالگو Hidalgo نے آزادی کا اعلان ۱۶ ستمبر ۱۸۱۰ء کو کیا تھا۔ چنانچہ ایک بازار کا نام "۱۶ ستمبر" ہے۔ اسی طرح ایک اور بازار کا نام "۲۰ نومبر" ہے۔ علیٰ ہذا کوئی اجنبی یا سیاح جب میکسیکو آتا ہے تو لامحالہ ایک نہ ایک دن ان تاریخوں کی اہمیت دریافت کرتا ہے۔ گویا نخواہ مخواہ میکسیکو کی تاریخ کے درخشاں پہلوؤں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ خود قوم پر بھی اس کا اثر بہت اچھا پڑتا ہے۔ بچے بچے کو اپنی تاریخ کے اہم واقعات سے

آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

صرف مشاہیر اور تاریخوں ہی پر اکتفا نہیں، ایک بازار کا نام آرٹیکل ۱۲۳ Article—123 ہے۔ یہ میکسیکو کے کانسٹی ٹیوشن کی طرف اشارہ ہے جو آخری مرتبہ ۱۹۱۷ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس کانسٹی ٹیوشن کی دفعہ ۱۲۳ میں مزدوروں کے حقوق بالوضاحت محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ اس بازار کا نام گویا اس بات کی یادگار ہے کہ میکسیکو کا کانسٹی ٹیوشن مزدوروں کی دوست اور خیر خواہ ہے۔

میکسیکو کا شہر اچھا خاصا وسیع ہے آبادی ۲۵ لاکھ کے قریب ہے۔ چنانچہ سینکڑوں بڑے اور چھوٹے بازار ہیں۔ ناموں کی تلاش میں یہاں کے ارباب اقتدار نے بڑی بڑی جدتیں دکھائی ہیں۔ اپنے مشاہیر کے ناموں اور اپنی تاریخ کے اہم واقعات سے پورا پورا فائدہ اٹھا چکے تو دنیا کی تاریخ اور دنیا کے جغرافیہ کی طرف رجوع کیا۔ یورپ کا کوئی مشہور دارالخلافہ یا شہر ایسا نہیں جس کے نام پر کسی نہ کسی بازار کا نام نہ ہو۔ ایک بازار کا نام "پیرس بازار" ہے۔ ایک کا نام "مارسیلز" ایک کا نام "لندن" وغیرہ وغیرہ لیکن ایسے بازار سب کے سب ایک دوسرے سے متصل اور ایک ہی علاقے میں واقع ہیں۔ چنانچہ آپ سے اگر کوئی بازار پیرس کا ذکر کرے تو آپ کو نام سنتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ شہر کے کس حصے میں واقع ہے۔ علیٰ ہذا ایک اور علاقہ ایسا ہے کہ اس میں سب بازاروں کے نام دنیا کے مشہور دریاؤں پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً نیل، ڈینوب، دجلہ، فرات، رائن وغیرہ شہر کے ایک اور علاقے میں سب بازاروں کے نام دنیا کے مشہور اہل فن اور اہل قلم کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً شیکسپیئر، ڈارون، ریناں، کوپرنیکس وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور علاقہ میں سب بازاروں کے نام جنوبی امریکہ کے نام پر رکھے گئے ہیں مثلاً برازیل ارجنٹائن، کیوبا، گوائی لاما وغیرہ

لیکن جہاں کسی بازار کا نام پہلے ہی کوئی خاص تاریخی یا اسی قسم کی کوئی اور اہمیت

رکھتا ہو اسے بالکل نہیں بدلتے، خواہ یہ تاریخی اہمیت قومی ہو یا محض مقامی اور خواہ کوئی ادبی یا کوئی اور اہمیت ہو۔ اس کی مثال لاہور میں یہ ہے کہ انارکلی بازار، چوک زرخان تیرانداز کی گلی۔ ایسے نام نہ بدلے جائیں کیونکہ ان میں مقامی تاریخ کے کئی دلچسپ پہلو نکلتے ہیں۔ یہاں ہر شہر کی مقامی تاریخ میں خاص طور پر دلچسپی پیدا کی جاتی ہے ہر شہر کا اپنا ایک عجائب خانہ ہے جس میں مقامی تاریخ، تصاویر یا نقشے یا دیگر یادگاریں اور علاوہ بر آں مقامی صنعت وحرفت کے نمونے خاص طور پر رکھے جاتے ہیں تاکہ سیاح فوراً اس شہر کی تمام خصوصیات سے آگاہ ہو جائے اور اہل شہر خود بھی جان لیں کہ ان کے شہر کی تاریخ میکسیکو اور میکسیکو کی قومی زندگی میں باعتبار صنعت وحرفت اور فن اور کاریگری کے کیا اہمیت رکھتی ہے۔

تاریخ اسلام بے شمار مشاہیر کے ناموں سے پُر ہے۔ اور عالم اسلام میں بہت سے شہر مثلاً مکّہ، مدینہ، بغداد، قرطبہ، غرناطہ ایسے شہر ہیں جو قوم کے ذہن میں محکم ہو جائیں تو احساسِ قومی کو تقویت پہنچے گی۔ علیٰ ہذا تہذیب اسلامی اکثر مشہور حکماء اور ادیبوں کی ممنون احسان ہے۔ مثلاً جلال الدین رومیؒ، خواجہ معین الدّین چشتیؒ یا شعراء میں حافظ، عمر خیام اور ہمارے اپنے شعراء میں غالبؔ، ذوقؔ، محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ، مزید غور کیا جائے تو ہماری تاریخ اور تہذیب کے کئی پہلو ایسے نکلیں گے جن سے ہماری قوم کو آگاہ ہونا چاہیئے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس نقطہ نظر سے تجویز اور مشورہ کے طور پر ناموں کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور اس فہرست کو پاکستان کے تمام صوبوں اور صوبوں کی معرفت میونسپل کمیٹیوں کے پاس بھیجا جائے اور ان کی توجہ بالوضاحت اس مقصد کی طرف مبذول کرائی جائے جو اس کی تہہ میں ہے اور اس غرض کے ہر جگہ ہوشیار لوگوں کی کمیٹیاں بنائی جائیں جو شہر کے تمام بازاروں کے ناموں پر غور کریں۔ میری ناقص رائے ہے کہ یہ نیک کام پاکستان کی وزارت داخلہ بطریقِ احسن انجام دے سکتی ہے۔ اس لئے یہ مشورہ آپ کے

گوش گزار کرنے کی جرأت کی۔ علاوہ بریں انگریزی الفاظ مثلاً روڈ، سٹریٹ وغیرہ کی لعنت سے بھی نجات حاصل کرنی چاہیئے۔ مغلوں کی دلّی میں ہر سڑک اور بازار کا نام موجود تھا لیکن روڈ اور سٹریٹ استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی، بازار، چوک، چوراہا، تراہا، چھتہ، گلی، کوچہ وغیرہ وغیرہ۔ کئی الفاظ اردو کے ایسے ہیں یا وضع کئے جا سکتے ہیں جو روڈ، اسٹریٹ وغیرہ کا کام دیں۔

ہمیشہ آپ کی خیریت اور بہبود کا طالب

بخاری

چمپا اور دوسرے افسانے

(مولانا عبدالمجید خان) سالک (بٹالوی) کے ہاتھ آج ہتھکڑی میں بند ہیں اور صفحۂ قرطاس اس کی سحر نگاری سے محروم لیکن چہرۂ فطرت کے جو خال اس کی قلمطرازی کے ممنونِ احسان ہیں وہ ہمیشہ چشم امتیاز کی پتلی بنے رہیں گے۔

یہ انتخاب بہت عجلت سے مرتب کیا گیا ہے کہ جب تک زندان کی چار دیواری سالک کو اہل نظر سے پوشیدہ رکھے۔ سالک کے شیدائی اس کے روشن دل کی ضیا پاشی سے محروم نہ رہیں۔ اگر وہ "گمنام" گمنامی کا شیدا۔ وہ عزلت نشینِ محشر۔ وہ انجمنِ خلوت اس وقت حراست و بند سے آزاد ہوتا تو یقین نہیں کہ وہ اپنی گمنامی کے نقاب کو یوں چاک چاک دیکھنا گوارا کر سکتا۔ کیونکہ اس کی نقادانہ نظر اور نگاہ انتخاب کج بیں اور نکتہ چیں ثابت ہوتی — ایک وقت اور صرف ایک وقت — جب وہ اپنی بیش بہا تصانیف کو کھول کر اپنے سامنے میز پر رکھ لیتا۔

وہ شخص جو ادب لطیف کے خیابان سے منہ موڑ کر صحافت کی سنگلاخ زین اور سیاسات کے خارزار میں گامزن ہوا۔ جذبۂ وفا کو ہمیشہ اپنے سینے میں لئے پھرا۔ گلزار و گل گشت میں یہی رنگ و بو تھا۔ بادیۂ دشت میں آج یہی اس کی آبلہ پائی ہے۔ اس سے اہل مذاق برسوں لطف اندوز ہوتے رہے۔ اور اس سے اہل درد آج اشک ریز و غمزدہ ہیں۔

افسانہ نگاری میں وفا کو وہ ہمیشہ "عشق کی دلہن" سمجھتا رہا۔ اور عورت کے دل کو

خواہ وہ "فلورا پارکنس" ہی کیوں نہ ہو، اس کا حجلۂ عروسی اس کی "چمپا" نے اپنے سوامی کے قدموں میں جان دی۔ اس کی "عذرا" کی وفا حسد اور رشک کو پامال کر گئی "ہیولا" کی آہ و زاری نے دیوتاؤں کے دل ہلا دیئے اور "موہنی" کے عشق کا شعلہ اب تک برات کی ہیبت اور تاریکی میں ہمالہ کی برفانی چوٹیوں پر نظر آتا ہے۔

ہمارے شعر و سخن کے آئینے میں عشق کو اپنا چہرہ اکثر دیوانوں کا سا نظر آتا ہے یہاں تک کہ عشق جنوں کو اپنا ایک اور دوسرا نام سمجھتا ہے۔ "سدا بہار ٹاپو کا ہندی" میں عکس اور معکوس — اسم اور مسمّیٰ دونوں سامنے کھڑے ہیں۔ اور جو نظر فریب نظارہ ہمارے پیش نگاہ ہے وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ماتھے پر تیوری چڑھائے ایک نقادانہ اور مربیانہ انداز میں کھڑے ہو کر اس پر تبصرہ کریں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی آنکھیں بند کر لیں اپنے حواس کو مخموری میں گم کر دیں۔ اور کتاب کو اپنے بے جان ہاتھ سے گر پڑنے دیں۔

سالکؔ کی تحریر سازِ دل میں ضرور کوئی نہ کوئی تار ایسا چھیڑ جاتی ہے۔ جو نغمے کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی تھرتھراتا رہتا ہے۔ اور بارہا میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ایسے تار بھی ہیں جن کو مضراب نے نہیں چھوا۔ پھر بھی ہم آہنگ ہیں اور کانپ رہے ہیں۔ "ہیولا" ایک چھوٹا سا افسانہ ہے لیکن "ہیولا" کو جیسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ سالک نے مجھ سے کبھی نہیں کہا۔ لیکن مجھے اس وفا شعار ہندو دوشیزہ اس عصمت و عفت کی دیوی کے ماتھے پر تلک کا ٹیکہ نظر آتا رہتا ہے۔ "ارشاد" کی کشتی دیکھتے ہی دیکھتے نیلے افق میں غائب ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر عشق کی دل دوز وحشت اب تک ہنس رہی ہے

سالک کو انتہائے جذبات کا بہت شوق ہے۔ تہذیب و تمدن کے دائرے کے اندر، لاہور اور بمبئی کے خوشنما بنگلوں میں اس نے جذبات کو پابجولاں دیکھا تو انہیں

"سدا بہار ٹاپو" میں دلدلوں اور سرکنڈے کے جُھنڈوں کے بیچ میں سے کرا نکی عریانی مستی اور پاکیزگی کو آزاد چھوڑ دیا۔ جہاں مرد صرف مرد اور عورت صرف عورت ہوتی ہے جہاں کے طوفان سخت بلاخیز ہیں اور درندے سخت خونخوار۔

لیکن سالک کا دل حیات کی نزاکتوں اور جذبات کی لطافتوں سے نا آشنا نہیں۔ اس کے سینے میں بے شمار ہلکے ہلکے درد اور ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھتی ہیں مگر غضب یہ ہے کہ وہ آفات و مصائب کو دلیرانہ برداشت کرنے والا جواں مرد اس شعریت کو اپنی فطرت کی کمزوری سمجھتا ہے" ہلال عید" جو اس کے قلم کی بے ساختگی اور بے تکلفی اور اس کی نازکی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک سرگوشی ہے جو کبھی بلند آہنگ نہیں ہوتی۔

میں یہ کہہ دیتا کہ سالک بار ہا ایک لفظ سے وہ کام لیتا ہے جس کے سرانجام دینے میں ہندوستان کے اکثر انشا پردازوں کے لمبے لمبے فقرے ناکام رہے ہیں۔ الفاظ میں وہ موسیقی اور شیرینی بھر دیتا ہے جو صورت کو معنی سے زیادہ دلآویز بنا دیتی ہے لیکن مجھے اس کے لئے سالک کی "چترا" کا ذکر کرنا پڑے گا اور وہ اس ادیب سحر طراز اس شاعر شیریں مقال، اس آئینہ دارِ ٹیگور کے ذوق سخن کا ایک دوسرا پہلو ہے۔

میری یہ ہذیان تحریری سالک کی کافر ماجرائی کے ہم رکاب ہے۔ اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ حیات ابدی کا دامن میرے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے اس کی کبھی جرأت نہ ہوتی۔ اگر مجھے یہ فخر حاصل نہ ہوتا کہ میرے نیاز مخلصانہ نے تبسم حوصلہ افزا کو اکثر سالک کے لبوں پر کھیلتے ہوئے دیکھا ہے

آج وہ حراست میں ہے اور شاید اب بھی مسکرا رہا ہے۔ نیاز مند آنکھیں پھر اس مسکراہٹ کو دیکھیں۔

"پطرس"

ایک غیر مطبوعہ کتاب کا دیباچہ

یہ کتاب ساٹھ مضامین کا مجموعہ ہے جو ۲۹ پاکستانی اور ۳۱ غیر پاکستانی (بیشتر امریکن) اکابر و مشاہیر کے خیالات و مشاہدات کے آئینہ دار ہیں۔ ہر حصے کے پہلے مضمون کو چھوڑ کر باقی مضامین کی ترتیب بلحاظ ابجد ہے ورنہ حفظ مراتب میں نہ معلوم کیا لغزشیں سرزد ہوتیں۔ پاکستانی مضامین چند ایک اردو اور دیگر مضامین تمام تر انگریزی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ مترجمین کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ یہ کام انہوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

مجموعے کا خیال ایڈورڈ، آر، مرو (ADWARD-R-MURROW) کی ایک تالیف دِس آئی بی لیو (THIS I BELIEVE) سے پیدا ہوا۔ مرو صاحب امریکن ریڈیو اور ٹیلیویژن کے مشاہیر میں سے ہیں۔ کولمبیا براڈکاسٹنگ سسٹم کے وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ حالات حاضرہ خصوصًا خارجی اور بین الاقوامی تعلقات کے ماہرین میں ان کا رتبہ بلند سمجھا جاتا ہے اور تعلیمی مسائل سے بھی ان کو بہت دلچسپی ہے لاکھوں لوگ ان کے ترتیب دیئے پروگرام کو غور سے سنتے اور ان سے اثر پذیر ہوتے

مرو صاحب اس سے بے حد متاثر ہوئے کہ پچھلی جنگ عظیم میں اہل انگلستان نے بہت ثابت قدمی دکھائی اور باوجود بے سرو سامانی کے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور یہی نہیں کہ تیغ و تفنگ کے جوہر دکھائے بلکہ اپنے قدیم اصولوں اور روایتوں

کی پابندی میں بھی کہیں خم نہیں کھایا۔ چنانچہ جب وطن، عدل وانصاف، جمہوریت، ملت کا خیال، جب بھی ان کے امتحان کی نوبت آئی ہر انگریز نے بلا سوچے سمجھے اپنے قدیم اصولوں کی پیروی کی اور شدید خطرے کے زمانے میں بھی جب کہ دل یہی چاہتا ہے کہ کسی بات میں بہت من بیخ نہ نکالی جائے۔ اپنی روایات کو پس پشت نہ ڈالا۔ اس سے مرد صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی قوم کا عمل دراصل اس کے عمیق عقائد پر مبنی ہوتا ہے۔ اور وہی کسی بحران کے زمانے میں بروئے کار آتے ہیں۔ یہاں سے انہیں تلاش ہوئی کہ امریکنوں کے پاس عقائد کیا ہیں؟ اور اس غرض کے لئے انہوں نے بڑے لوگوں کی طرف رجوع کیا اور ان سے کہا کہ آپ اپنے عقائد اور خیالات کا مختصر سا خاکہ کھینچ دیجئے۔ اس کے جواب میں جو مضامین وصول ہوئے انہیں پہلے ایک، اور پھر ایک دوسری کتاب میں شائع کیا۔ دونوں کتابیں غور سے پڑھی گئیں۔ چند مضامین ان کے اس کتاب میں بھی شامل ہیں اور امید ہے کہ دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

مکتبہ فرنیکلن نے ایسا ہی سوال میری وساطت سے پاکستان کے مشاہیر کے سامنے پیش کیا۔ جن مہربانوں نے اس کے جواب میں مضمون عطا فرمایا میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

پاکستانی اور امریکنی مضامین یکجا شائع ہوں تو دل ان کا مقابلہ کرنے کو چاہتا ہے دونوں ملکوں کا آپس میں جو تفاوت ہے وہ ظاہر ہے۔ ایک امیر ملک، ایک غریب ملک —— ایک آزادی کا عادی، دوسرے کا تعارف آزادی سے بالکل ہی نیا —— ایک بیشتر مسیحیوں کا ملک، دوسرا مسلموں کا —— ایک کی تاریخ یورپ سے وابستہ، دوسرے کا ماضی یورپ کی مخالفت سے لبریز —— ایک یوروپین ڈھانچے کا ملک، دوسرا ایشیائی ڈھانچے کا ملک، اس لئے حیرت ہوتی ہے کہ دونوں ممالک کے مشاہیر کے خیالات میں جس قدر بھی ہم آہنگی ہے وہ کس قدر زیادہ ہے۔ دونوں قنوطیت سے دستبردار

دونوں ایمان کے قائل، جد وجہد کے قائل، عزم وخدمت کے قائل، دونوں کے نزدیک معاشری خدمت اہم ترین ضروریات ملی میں سے ہے ۔ البتہ امریکہ میں ان خیالات کو بہت کچھ سہولتیں اور گنجائشیں عمل کی نصیب ہو چکی ہیں اور ہمارے ہاں ابھی بہت کچھ بطن مستقبل میں ہے ۔ لیکن فخر و مسرت کا مقام ہے کہ ہمارے ہاں جو لوگ برسرِکار ہیں یا جن کا معاشرے میں حصہ لینا لابدی ہے یا جو ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ جو بہت عرصہ تک سربراوردہ رہنمایانِ قوم مہیا کرتا رہے گا ان کے خیالات اولوالعزمانہ ہیں ۔ وہ بلندی کے خواہاں ہیں، ملت کا احساس رکھتے ہیں، معاشری خدمت کی اہمیّت کو پہچانتے ہیں، ایمان پاکیزہ زندگی کا جزوِ عظیم سمجھتے ہیں اور منزل سے دور سہی لیکن ترقی کی سمت انہیں باوجود اپنی پسماندگی کے ایسی ہی صاف دکھائی دے رہی ہے ۔ جیسے امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کو ۔

جب میں اس مجموعے کو اس نظر سے دیکھتا ہوں تو اس کی قدر بڑھ جاتی ہے ۔ اگر میری قوم فی الواقع مجموعی طور پر ان خیالات کی علمبردار ہے جو فرداً فرداً مشاہیر نے اپنے مضامین میں واضح کیے ہیں ۔ تو ہمارا مستقبل ایسا نہیں کہ ہم گھبرا جائیں آپ بھی اس کتاب کو اسی نظر سے پڑھیئے تو دلچسپی کا باعث ہوگی ۔

(بشکریہ مکتبہ فرینکلن)

عشق کی خودکشی

مفصلہ ذیل تحریر کے پرزے جیل خانے کی اس کوٹھڑی میں پائے گئے جہاں میرا دوست قاسم پھانسی پانے سے پہلے محبوس تھا اور مجھے سعادت علی خاں داروغہ جیل کی مہربانی سے دستیاب ہوئے تھے۔ قاسم جس کی زندگی شوق اور کیف کے سرچڑھا دینے والے جذبات سے معمور تھی آج دوسری دنیا میں ہے جہاں خود جانے سے پیشتر وہ اپنی محبوب بیوی کو بھیج چکا تھا خدا ان دونوں کی روحوں کو عافیت عطا فرمائے۔

(ارشد)

(۱) شاید مجھے داروغۂ جیل کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ اس کی اجازت سے میں یہ چند سطریں تحریر کر رہا ہوں لیکن میرا دل اس وقت جذبات سے بالکل خالی ہے۔ میرے دل کی اس وقت وہی حالت ہے جو کسی محفل کی صبح کے وقت ہوتی ہے۔ جب سحر کی پھیکی روشنی اور تھکان کا خواب آلود سکون مشاغل شبانہ کی ہوسناکیوں اور عشرتوں کو بے رنگ اور بھیانک کر دیتا ہے میرا دل ایک کھنڈر ہے جس میں زندگی نہیں آثار ہیں، جہاں حال بیدار نہیں، ماضی خفتہ ہے، جہاں نہ نالہ ہے نہ نغمہ، فقط ایک ویران سی گونج ہے جس کے میرے نزدیک کوئی معنی نہیں جو لوٹئے زندگی اور غلغلۂ حیات نہیں۔ ایک خندۂ بے مسرت، ایک فریاد

بے درد ہے۔

کل مجھے قانون کی انتہائی سزا دی جائے گی۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔ ہر شخص اسس کے لئے تیار ہوتا ہے۔ موت کے لیے کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ موت اسی لیے موت ہے کہ ناگہانی ہوتی ہے۔ ہر ایک موت ناگہانی موت ہے۔ موت کا وقت معین ہے اور اس طرح معین کیا گیا ہے کہ بے موقع آئے۔ اگر ہمیں اپنی موت کا وقت معلوم ہو تو ہماری تمام زندگی اس موت کی تیاری میں صرف ہو جائے زندگی اس قیام کی مانند ہو جو ریل کے اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں کیا جاتا ہے۔

(۳) انسان کی ہستی فوری ضروریات اور فوری انتظامات کا ایک اجتماع ہے جس میں عشق کی ناپائیداری حسن کی بے وفائی کی طرح ہو جہاں تعمیر ایک غلطی ہو جہاں اعتماد ایک حماقت ہو۔

مجھے اپنی موت کا وقت بتا دیا گیا ہے اس لیے میں نے جو کچھ تعمیر کیا تھا اسے منہدم کر چکا ہوں۔ مجھے اس تخریب میں بہت کم تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے کبھی کسی عمارت کی بنیاد استوار نہیں رکھی، میری آرزوؤں کے محل، میری توقعات کے قصر، میرے ارادے کے قلعے سب بلند اور شاندار تھے لیکن مجھے انہدام کے وقت معلوم ہوا کہ سب کی بنیادیں نہایت کمزور تھیں۔

شروع میں جب میں نے مجرم ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ تو اکثر لوگ مجھے سچا جانتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ میں اپنی بیوی کا قاتل نہیں ہو سکتا ارشد بھی مجھے بے گناہ سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ مجھے کتنی مدت سے جانتا تھا۔ ایسے لوگ مجھ پر رحم کھاتے تھے اور مجھ سے ہمدردی کرتے تھے

چند ایسے بھی تھے جو مجھے جھوٹا سمجھتے تھے ان کا گمان تھا کہ رضیہ کی موت میرے ہی ہاتھوں ہوئی ہے وہ بھی مجھ پر رحم کھاتے تھے لیکن مجھے حقیر جانتے تھے

یہ دونوں غلطی پر تھے۔ میرے اعترافِ جرم کو دیوانگی سمجھنے والے سن لیں کہ میں نے واقعی رضیہ کو قتل کیا ہے۔ اسی دائیں ہاتھ نے جو اس وقت خامہ فرسائی کر رہا ہے۔ رضیہ کے نازک گلے کو اپنی لمبی لمبی انگلیوں میں دبا کر اس کے سانس کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے میرے انکارِ جرم کو میری بزدلی اور دروغ گوئی سمجھنے والے سن لیں کہ جب میں نے عدالت میں کھڑے ہو کر بلا تامل کہہ دیا تھا کہ میں رضیہ کا قاتل نہیں تو میرے دل اور زبان میں وہی سچائی تھی جس نے مجھ سے بعد میں اعتراف کروایا۔ میں ایک نہیں، دو ہوں۔ شاید میں دس بیس ہوں۔ مجھے اب اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں احساس ہو رہا ہے کہ میری ایک تنہا ہستی میں کس قدر کثرت تھی۔ رضیہ کو چاہنے والا یہی انسان تھا جو اب اس کے قتل کی سزا میں پھانسی پانے والا ہے۔ میں کیسے مانوں؟ اگر میں ایک ہوں تو میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں —— کہ میں نے رضیہ کو اس لئے قتل کیا کہ مجھے اس سے محبت تھی۔ یہ کتنی لغویات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن نہیں یہی ٹھیک ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ میں سب کچھ ہوں۔ مجھے نہیں معلوم میں کیا ہوں۔ شاید میں نے غلطی کی ہے میں ایک کمزور ہوں۔ سب انسان کمزور ہوتے ہیں۔

(۳) دو سال ہوئے میں اور رضیہ بیاہے گئے۔ اس کے سنگدل والدین نے اب تک معاف نہیں کیا میرے محلے کے لوگ اب تک میری شادی کو "اوباشی" سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ وہ رضیہ کے والدین کی مرضی کے خلاف ہوئی۔ اگر ہمارے محلّے میں حسن اس قدر کمیاب نہ ہوتا تو شاید چند اور والدین بھی اس وقت اپنی بیٹیوں سے ناراض ہوتے۔ لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے مامون رہنے کی وجہ ان کی اولاد کی عصمت شعاری ہے۔ شاعرانہ خیال ہے۔ وہ اپنی لڑکیوں کی نیک خصالی پر فخر کرتے ہیں۔ اس صفت پر فخر کرتے ہیں۔ جو مردوں کے وہم و تخیل نے عورت کو بخش دی ہے۔ ان سے کہہ دو جو مجھ سے بچ گئے ہیں کہ اصل وجہ ان کی لڑکیوں کی پاکبازی نہیں میری عالی نگاہی تھی جو ان میں سے کسی کو بحیثیت بیوی کے

گوارا نہ کرسکتی تھی۔ یہ نقادان اخلاق سمجھتے ہیں کہ میں نے رضیہ کو اس کی بدچلنی کی وجہ سے مار ڈالا۔ او خدا جب مجھے پھانسی ہی پانا ہے تو محض ایک قتل کے بدلے کیوں؟ میں رضیہ کا قاتل کیوں ہوں؟

رضیہ کو کس نے مارا؟ شاید میں نے! یہ نہ کہو؟ تم رضیہ سے جا کر پوچھ لو۔ وہ کبھی میرا نام نہ لے گی۔ وہ کبھی یقین نہیں کرسکتی کہ میں نے اسے قتل کیا ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمام دنیا سے بڑھ کر اس سے محبت کرتا تھا۔ تم یقین مانو کہ وہ اس محبت کی قدر کرتی تھی محض میری خاطر اس نے تمام جہاں کے الزامات اپنے سر لئے۔ دنیا بھر کے مصائب اس نے میرے ساتھ مل کر برداشت کیے۔ وقت پر میرے لیے کھانا تیار کرنا اور بڑے اہتمام سے میرا بستر کو بچھانا وہ اپنی زندگی کے اعلیٰ فرائض میں سے سمجھتی تھی۔ گرمی کے دنوں میں ساری ساری دوپہر وہ مجھے پنکھا جھلتی رہتی۔ رات کو بڑی دیر تک میرے انتظار میں جاگتی رہتی۔ جانے دو، نہ کہو کہ میں نے اسے مارا ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔ تم اس سے پوچھ لو۔ جاؤ تمہیں اختیار ہے۔ پوچھ لو۔

عورت اگر چاہے تو مرد کی زندگی کو تباہ کرسکتی ہے۔ فطرت نے دلوں کے توڑنے کے جس قدر بھی ڈھنگ ہیں وہ تمام عورت کو سکھا رکھے ہیں۔ قدرت نے مردوں کے دل محض اس لئے بنائے ہیں کہ عورتیں ان کو بے پروائی سے توڑ ڈالا کریں۔ ہماری آنکھیں اس لئے ہیں کہ یا ہم ان کو دیکھیں یا ہم ان کے لئے روئیں۔ عورت کو خراج نگاہ چاہیئے یا خراج اشک۔ اسی دولت سے وہ کشور دل پر حکمرانی کرتی ہے ان کا عہد ایک دورِ ظلم ہوتا ہے اور ایک عہد ستم جہاں بغاوت کے بغیر چارہ نہیں۔

میں نے رضیہ سے بغاوت نہیں کی۔ میں نے صرف یہ چاہا کہ وہ مجھ سے محبت کرے۔ وہ برف تھی۔ میں نے چاہا اسے آگ بنا دوں وہ برودت تھی میں چاہتا تھا وہ حرارت ہو۔ وہ چپ چاپ پانی کی طرح بہتی تھی اور میں اسے شعلوں کی طرح بھڑکانا چاہتا تھا۔ میں رات کی خاموشی میں بار ہا گھنٹوں تک متواتر اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لئے لبے لبے

درد بھرے فقروں میں اس سے اپنے عشق کی داستان کہتا۔ اسے دیوی سمجھ کو پجاریوں کی طرح اس کی پوجا کرتا۔ وہ بُت کی طرح بیٹھی رہا کرتی۔ میں اس سے کہتا "اے میرے دل پر حکومت کرنے والی ملکہ! میں تیرا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ تیری خدمت کرنا میرے بلئے جنت میں زندگی گذارنا ہے۔ کیا تجھے مجھ سے محبت ہے؟" وہ کچھ نہ بولتی۔ میں اس کی باہیں مروڑتا۔ جب بھی وہ کچھ نہ بولتی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ظاہر ہوتے۔ مجھے خوشی حاصل ہوتی۔ کیونکہ اس پر بھی وہ کچھ نہ بولتی۔ تم کہو گے شرم کی وجہ سے! تم کیا جانو؟ تم نے صرف عورتوں کو دیکھا ہے۔ تمہیں "نسوانیت" کا کچھ علم نہیں۔ تم صرف مرد ہو، تم میں مردانگی نہیں۔ تمہاری تمناؤں میں بلندی کی قابلیت نہیں۔ تم کو چھوٹی چھوٹی باتیں خوش کر سکتی ہیں او کم ظرف انسانو! تم مجھے کچھ نہ کہو۔"

(۴) کئی دفعہ میں رات کو دیر میں گھر آیا۔ اس نے کبھی اس کا گلہ نہیں کیا۔ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں طلب ہوتی ہے۔ طلب کے ساتھ شکایت ہوتی ہے۔ میں کیا جانوں وہ میرا انتظار کرتی تھی۔ میں نے کئی دفعہ اس سے پوچھا "رضیہ میرا دیر سے آنا تمہیں ناگوار تو نہیں معلوم ہوتا؟" وہ کہتی "آپ کی کوئی بات مجھے ناگوار معلوم نہیں ہوتی" تمہیں تمہاری بیوی یوں کہے تو تمہارے لئے اطمینان کا باعث ہو۔ شاید تمہیں کبھی یہ خیال بھی نہ آئے کہ جسے تمہاری کوئی بات ناپسند نہیں اسے تمہاری کوئی بات پسند بھی نہیں۔ شاید تم یہ کبھی نہ سوچو، تمہیں عورتوں کا تجربہ نہیں۔ تم میں غیرت نہیں۔

ایک دن میں نے اس سے کہا "رضیہ جب تم میری ہو، تو پھر کیا ہے کہ تم میرے ہوتے ہوئے بھی اس قدر وقت پڑھنے اور سینے پرونے میں صرف کر دیتی ہو؟ تم مجھ سے باتیں کیا کرو۔" وہ پھر بھی پڑھنے سے باز نہ آئی۔ میں نے اس کی سب کتابیں پھاڑ دیں۔ میں نے اس کے کپڑے جلا دیئے۔ وہ روتی رہی کھانا پکاتی رہی۔ ان کتابوں اور کپڑوں کیلئے روتی رہی جن کو وہ مجھ پر ترجیح دیتی تھی۔ میرے دل میں اس دن ایک ارادہ آیا۔ لیکن جلد غائب ہو گیا۔ اور میں مٹھیوں کو بند کر کے رہ گیا۔ دو دن میں اس سے روٹھا رہا۔ اس نے

مجھے نہ بتایا۔ تم کہو گے ڈرتی تھی، پھر تغافل کسے کہتے ہیں؟

کل میری زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ میں خوش ہوں۔ رضیہ کو مار ڈالنے کے بعد میرا زندہ رہنا فضول ہے۔ جس پروانے کو شمع کے جلتے ہوئے مر جانا چاہیئے تھا۔ وہ شمع کے بجھ جانے کے بعد بھی زندہ رہے تو یہ عشق کی خامی ہے۔ رضیہ! تم مجھے معاف کر دینا دنیا کی معافی کی مجھے پروا نہیں۔ دنیا میں میں نے اگر کسی عورت کے ساتھ وفا نہیں کی تو اس کا الزام مجھ پر عائد نہیں ہوتا۔ وہ اسی قابل تھیں کہ ایک رات کے لئے بدرِ منیر ہوتیں اور بس ان کو چند لمحوں کے مشغلے سے زیادہ کچھ بھی سمجھنا مذاقِ سلیم کا خون کرنا تھا اس پر اگر اہلِ دُنیا مجھے قصوروار سمجھتے ہیں تو مجھے اس کی پروا نہیں۔ وہ کل مجھے مار ڈالیں گے۔ اس سے زیادہ وہ کسی کو کیا سزا دے سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کیا انتقام لے سکتے ہیں۔ افسوس! اگر مجھ کو معلوم ہوتا کہ مجھ سے یوں بدلہ لیا جائے گا۔ تو اب ناکردہ گناہوں کی حسرت دل میں نہ ہوتی۔ کسی سے کوئی ایسا پیمان نہ باندھتا جس کو توڑتے ہوئے میرے دل کو رنج ہوتا۔ میں رضیہ سے شادی کرتا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ جس کی زبان نے مجھے کبھی پیار سے نہیں بلایا جس نے چپ کے سوا کبھی دوسرا جواب نہیں دیا۔ جس نے دل کا حال ہمیشہ مجھ سے چھپایا۔ جیسے میرے مشتعل جذبات کے روح سوز شعلے کبھی نہ بھڑکا سکے۔ جیسے میرے عشق کے فنا انجام زلزلے کبھی نہ ہلا سکے۔ اس سے شادی کرتا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

چودہویں کی چاندنی میں وہ سفید لباس پہنے تھک کر لیٹی ہوئی تھی۔ اور میں اس کے پاس بیٹھا ہوا اپنے دل کی بے قراری کو کلپتے ہوئے ہونٹوں سے لرزتے ہوئے فقروں میں بیان کر رہا تھا۔ رضیہ تم نے مجھ پر کیا جادو پھونک دیا ہے کہ میرے جسم میں کوئی روح ہے تو وہ تم ہو۔ میری آنکھوں میں کوئی نور ہے میرے دل میں کوئی سرور ہے تو وہ تم ہو۔ میری زندگی، میری راحت، اب یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ میں تمہارے بغیر اس دنیا میں کہیں خوش

پاؤں۔ رضیہ صرف تمہارے ہوتے ہوئے میرے سینے میں ہزاروں امنگیں اٹھتی ہیں۔ آرزوؤں کا ایک طلاطم بپا ہوتا ہے۔ تمناؤں کا ایک کہرام مچ جاتا ہے۔ تمہیں ایک دفعہ دیکھ لینا، ساز ہستی کے تمام تاروں کو یوں چھیڑ دیتا ہے جیسے ہوا کا کوئی لطیف جھونکا ان پر سے گذر گیا۔ میرے دل میں نغمے گونجتے ہیں کہ تو ان کو سنے۔ کیا تو سنتی ہے ؟ وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے کہا: "رضیہ سنتی ہے" کہنے لگی "سنتی ہوں"۔ میں نے کہا کیا تمہارے دل میں موسیقی نہیں؟ کیا تم مجھے وہ نہیں سنانا چاہتی ؟ " وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ لیا۔ اور بہت انکسار سے کہا۔ "رضیہ کچھ تو کہو"۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ شاید یہ کہا کہ میں کیا کہوں ؟ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی بند آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹوں کے سکون کو دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کی بے پروائی کو دیکھتا رہا۔ اس کا تغافل مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میرے ہاتھ اس کے گلے کے قریب آتے گئے۔ میری انگلیوں کو ایک زبردست خواہش نے فولاد بنا دیا۔ میرا نچلا ہونٹ میرے دانتوں سے کٹ گیا۔ میرے دائیں ہاتھ کا پنجہ کھڑ آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں مجھے اس کی آنکھوں میں دہشت نظر آئی۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں اور دحشی ہو گیا۔ میرے پنجے کی گرفت اور مضبوط ہوتی گئی۔ اس نے کچھ کہا۔ لیکن اس کے کہنے میں الفاظ نہ تھے۔ میں اس کا گلا بھینچتا گیا۔ حتیٰ کہ میرا ہاتھ تھک گیا۔ یہاں تک کہ اس کا اور دنیا کا تعلق منقطع ہو گیا۔ مجھے چاند تاریک دکھائی دینے لگا۔ میری نگاہ میں ایک سیاہ سی سرخی پھر گئی۔ میرا گلا خشک ہو گیا۔ میں نے ایک چیخ ماری اور اس سے لپٹ گیا۔ چلا چلا کر پوچھتا رہا کہ "رضیہ! میری جان!! تم کیوں چپ ہو؟ تم کو کس نے مار ڈالا ہے! رضیہ میری پیاری رضیہ! تمہارا قاتل کون ہے ؟" وہ کچھ نہ بولی

(۷) وہ بے چاری مر گئی۔ میرے ہاتھوں سے مر گئی۔ میں نے اسے مارا میں کل رجلدنگا اس نے میرا دل دکھایا۔ میں اس کے لیے مرتا تھا۔ وہ میری بہت خدمت کرتی تھی۔ عدالتی قوانین کی گرفت مضبوط ہے اور ان سے رہائی مشکل۔ مرد عورت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس

خیال سے کہ اس کی خواہشات کی تکمیل بطریقِ احسن ہو' وہ اس کی مرضی ڈھونڈتے رہتے ہیں کہ اسے پورا کریں۔ عورت دیوانگی کا سحر کرنا جانتی ہے۔ راحت کی نیند سلانا نہیں جانتی۔ اندھا کر دیتی ہے۔ اپنے قریب آنے کا رستہ نہیں بتاتی۔ اس نے تمام دنیا کو ناراض کیا کہ مجھے خوش کرے۔ میں نے اسے مار ڈالا کہ وہ مجھے خوش نہ کر سکی۔ کائنات ایک مجسم بے قاعدگی ہے۔ عورت کی محبت ایک افسانہ ہے۔ روح جسم کا دوسرا نام ہے۔ جذبات کی کوئی حقیقت نہیں ایک ہستی کئی ہستیوں سے مرکب ہوتی ہے۔ آج تم کچھ ہو۔ کل خدا جانے کیا ہو گے؟

قاسم

"پطرس"

(مخزن جون ۱۹۲۱ء)

صید و صیاد

۳؍دسمبر ۱۸۸۲ء کو رات کے وقت پیرس کا ایک نوجوان دریائے سین کے قدیمی پُل پر چلا جا رہا تھا۔ اس نے اس جہانِ فانی سے ہمیشہ کے لیے اپنا تعلق منقطع کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ اس کے قدم نہایت آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ اور جوں جوں وہ اپنی منزل کے قریب پہنچتا جاتا۔ اس کے دل میں اطمینان اور سکون بڑھتا جاتا تھا۔

یہ نوجوان (جس کا نام ایڈمنڈ سیوین تھا) جب پُل کے عین وسط میں پہنچ گیا تو جنگلے پر ہاتھ رکھے دریا کے سیاہ پانی کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کا جسم ذرا کانپا، اس کے دل کی حرکت ایک لمحہ کے لیے تیز ہوئی لیکن پھر وہ سنبھل گیا اور غافلانہ انداز میں اپنا اوور کوٹ اتارنے لگا۔

اوور کوٹ کو تہ کر کے اس نے زمین پر رکھ دیا۔ تھوڑے سے تامل کے بعد اس نے جنگلے کو مضبوط پکڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں وہ دریا میں کود پڑنے ہی کو تھا کہ کسی نے اُسے کندھے سے پکڑ لیا اور اس کے کانوں میں آواز آئی "ذرا ٹھہر جائیے حضرت!"

اس موت کے تمنائی نے اجنبی کے ہاتھ کو ایک جھٹکا دے کر ہٹا دیا اور پھر چھلانگ مارنے لگا لیکن اب کے بار اس کے کندھے کو ہاتھوں نے زور سے کھینچا اور پھر وہی آواز آئی "حضرت! ذرا ٹھہر جائیے، صرف ایک گھنٹے کے لیے ٹھہر جائیے! کیا اتنا بھی آپ کو بہت معلوم ہوتا ہے؟"

سیوین نے مڑ کر دیکھا اجنبی درمیانہ قد کا ایک دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ چہرے کے نقش باریک جن پر نیکی یا بدی کسی صفت کی کوئی تحریر نہ تھی صرف ایک تفکر سا تھا۔ آواز اس نازک وقت میں بھی نہایت مطمئن معلوم ہوتی تھی۔

لیکن موسیو سیوین کو غصہ سا آ گیا اس نے اپنے دل کو جس محنت سے خودکشی پر آمادہ کیا تھا اس کا یوں رائیگاں جانا اسے ناگوار معلوم ہوا۔
وہ جھلا کر بولا "آپ ہوتے کون ہیں؟"
اجنبی نے کہا حضرت میں تو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک کام ہے جو پیرس بھر میں سوائے آپ کے کوئی نہیں کر سکتا۔ ورنہ میں کاہے کو مخل ہوتا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ اگرچہ آپ کا خودکشی کا طریقہ نہایت بھدا ہے لیکن میں کیوں دخل دیتا لیکن بات یہ ہے کہ اس وقت ایک خاتون کو آپ کی امداد کی بہت ضرورت ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ یقین جانیئے میں یوں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔
سیوین بڑی درشتی سے ہنس کر کہنے لگا "تو تم نے میرے پاس آنے میں غلطی کی ہے۔ ایک عورت ہی کی خاطر تو میں یہ (اس نے دریا کی طرف ہاتھ پھیلا دیا)، عورت کی جنس کو میں یہاں جان کا خراج ادا کرنے آیا ہوں۔ اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا ہوں؟"
اجنبی بولا "قصور ایک عورت کا اور آپ سب عورتوں کو الزام دے رہے ہیں۔ اب انکار نہ کیجئے میں آپ کے منہ سے "نہ" نہیں سن سکتا۔ دوبارہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک خاتون کی چل کے مدد کیجئے۔ ایک نوجوان خاتون کی۔ ایک حسین خاتون کی۔ آپ اپنے سفر کو ایک گھنٹہ تک ملتوی کر دیجئے۔ محض ایک گھنٹہ تک، کیا یہ بہت زیادہ ہے؟ اس وقت سے لے کر ابد تک جتنا بھی زمانہ ہے آپ اس کے مالک و مختار ہیں۔ کیا آپ اس میں سے ایک گھنٹہ بھی کسی کو نہیں بخش سکتے؟"
سیوین نے جو باوجود ناراض ہونے کے اجنبی کی باتوں کو غور سے سننے لگا تھا۔ پوچھا "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"
اجنبی نے کہا "یہ دیکھیئے میں ابھی آپ سے کہتا ہوں یہاں سردی ہے آپ اتنی مہربانی کیجئے کہ اپنا اوورکوٹ پہن لیجئے۔ اور میرے ساتھ اس شراب خانے تک چلے چلئے

وہ جہاں سُرخ روشنی نظر آ رہی ہے۔ جو کچھ مجھے کہنا ہے آپ وہاں پہنچ کر سُن لیجئے اگر اس سے آپ کی تشفی نہ ہوئی تو آپ بے شک واپس آ جائیے اس میں ہے ہی کیا؟"

سیوین نے دریا کو ایک نظر دیکھا اور اجنبی کی بات مان لینے کو تیار ہو گیا۔ اپنا کوٹ پہنا اور ساتھ ہو لیا۔

اجنبی نے کہا "شکر ہے کہ آخر کار آپ مجھے مل گئے ورنہ خدا جانے میں کہاں مارا مارا پھرتا آج رات مجھے آپ سے پہلے دو آدمی آپ ہی کی طرح کے اور ملے تھے لیکن وہ کسی کام کے نہ تھے۔ بدتمیز کہیں کے۔ میری سنی ہی نہیں میں کیا کرتا۔ اس وقت وہ دونوں دوسری دنیا میں ہیں اور شاید تمنا کر رہے ہیں کہ کسی طرح واپس پیرس پہنچ جائیں۔ لیکن آپ بالکل میرے مطلب کے آدمی ہیں —— یہ لیجئے ہم پہنچ گئے۔ یہ شراب خانہ ہے تو چھوٹا سا لیکن کیا مضائقہ ہے .... پہلے آپ صاحب"۔

دونوں کمرے میں ایک طرف کو ہو کر بیٹھ گئے۔ اور ایک دوسرے کو غور سے دیکھنے لگے۔ اجنبی کی شکل پہلے کی بہ نسبت زیادہ عقاب سے مشابہ اور زیادہ متفکر معلوم ہوتی تھی لیکن یوں دیکھنے میں بُرا نہ تھا۔ موسیو سیوین پچیس برس کی عمر کا نوجوان تھا۔ چہرے کے نقش نفیس ترشے ہوئے، لباس پیرس کے دیہاتیوں کا، رنگ ذرا زرد۔ بولا "تو تمہارا کیا مقصد ہے؟

اجنبی نے کہا" مجھے اپنا مقصد تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ چل کے "شیر شکاری" کھیلئے۔ "شیر شکاری" کے کھیل سے تو آپ واقف ہوں گے؟

"نہیں"

"افسوس! انسان اپنی شہرت پر کیا بھروسہ کر سکتا ہے۔ تو حضرت آپ نے میرا نام تو ضرور سنا ہوگا؟ مجھے یوَل کہتے ہیں"۔

سیوین نے کہا "کہتے جاؤ، میں نے تمہارا نام کبھی نہیں سنا"۔

یوَل مایوسی کے لہجے میں بولا "جب تو مجھے بہت ہی افسوس ہے۔ تو جناب سنیئے۔

جو حضرات اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہیں ان کے لیے میں نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کر رکھا ہے جس پر انہیں کسی طرح کی ملامت نہ ہو سکے اگر آپ کو اس بات کا علم ہوتا تو آپ دریائے سین کے پاس جانے کی بجائے یقیناً میرے پاس آتے۔ اگر اشتہار دینے میں مجھ سے کوئی دقیقہ فروگذاشت ہو گیا ہے تو یہ میرا قصور نہیں۔ میں مجبور ہوں۔ میرا کام ہی ایسا ہے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ آپ نے معزز طبقوں میں میرا ذکر ضرور سنا ہو گا"

سیوین نے کہا "جو کچھ تمہیں کہنا ہے جلدی کہو، آدھ گھنٹہ سے زیادہ گذر چکا ہے اور مجھے ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا"

یوول نے کہا "میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ دیکھئے نا، آخر ایک موجد بھی سینے میں دل رکھتا ہے اس کے بھی حسیات کو صدمہ پہنچ سکتا ہے تو صاحب بات یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ انسان ایک حیوان متمدن ہے۔ تمدن حقوق و فرائض کے باہمی تعلقات کا نام ہے۔ چند فرائض ایسے بھی ہیں جن کو زندگی کے آخری لمحوں میں بھی پورا کرنا ضروری ہے۔ سوسائٹی کا اقتضا یہی ہے کہ آپ کو دنیا سے یوں اکیلے جانا مناسب معلوم ہوتا ہے جب کہ کئی لوگ ایسے موجود ہیں جو آپ کو تشریف لے جانے میں مدد دینے کے لئے تیار ہیں۔ تیار کیا؛ خواہشمند ہیں۔ جن کی مدد سے آپ کے وداع آخری کو نہ صرف زیادہ پُر لطف بلکہ زیادہ خوبصورت بنایا جا سکتا ہے۔ اس حسن آفرینی کے لئے میں نے ایک معمولی سا کھیل ایجاد کیا ہے جس میں دو کھلاڑی اعلیٰ درجہ کا لطف حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ان میں سے ایک کا انجام قطعی یقینی ہوتا ہے۔ زندگی سے تنگ آئے ہوئے دو آدمی آپس میں قرعہ اندازی سے فیصلہ کر لیتے ہیں کہ کون شیر ہے اور کون شکاری۔ اس کے بعد شیر اپنے گلے میں ایک نقرئی گھنٹی باندھ لیتا ہے اور شکاری ہاتھ میں ایک بھرا ہوا پستول لے لیتا ہے۔ کمرے کے تمام چراغ گل کر دیے جاتے ہیں اور صید و صیاد کو تنہائی میں چھوڑ دیا جاتا ہے پھر شیر کی مرضی کے مطابق موسیقی سے اس کی سامعہ نوازی کی جاتی ہے۔ پھر موسیقی بند ہو جاتی ہے شیر کی حرکت سے اس کے گلے میں لگی ہوئی گھنٹی بجتی ہے۔ شکاری اندھیرے

میں فائر کرتا ہے ایک دفعہ اور پھر ایک دفعہ اور۔ پھر چراغ روشن کر دیئے جاتے ہیں اگر شیر زخمی ہو گیا ہو تو پھر یقیناً مر جاتا ہے کیونکہ سب گولیاں زہر آلود ہوتی ہیں۔ اگر وہ بچ جائے تو گھنٹی اس کے گلے سے اتار کر شکاری کے گلے میں باندھ دی جاتی ہے اور یہ کھیل پھر سے شروع ہو جاتا ہے اسی طرح کھیل جاری رہتا ہے حتّٰی کہ ان میں سے ایک رخصت ہو جاتا ہے۔ پہلے پہل صرف مردوں میں اس کھیل کا رواج تھا۔ لیکن جب اس کی شہرت بہت بڑھ گئی تو ایک خاتون نے بھی اس میں شرکت کی درخواست کی۔ یہ بدعت کسی قدر پسند کی گئی۔ اب جہاں تک ممکن ہو سکے ایک مرد کو ایک عورت کا شریک بنایا جاتا ہے۔ عام طور پر وہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ تو صاحب اس کھیل کو بہت پسندیدگی نصیب ہوئی ہے میں نے اس میں ایک دو جدتیں بھی کی ہیں۔ مثلاً میں کبھی کبھی ایک خالی کارتوس بھی بھر دیتا ہوں سوائے میرے اور کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا کارتوس خالی ہے اس سے ذرا لطف اور بھی بڑھ جاتا ہے معزز حضرات اور معزز خواتین کو اب اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ دریائے سین میں پڑے پائے جائیں۔ وہ اب اس پُر لطف موت کو ترجیح دیتے ہیں

سیون نے پوچھا" لیکن تمہاری اس ہرزہ سرائی کو مجھ سے کیا تعلق؟ اگر مجھے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا منظور ہے تو یہ میرا اپنا ذاتی معاملہ ہے تم اس میں کیوں دخل دیتے ہو؟ میں سمجھتا ہوں تمہیں اپنے اس قبیح فعل کے لئے کسی فیس کی توقع ہے تو وہ پھر تم کو مجھ سے نہ ملی میں واپس پل پر جا رہا ہوں۔ اور نہیں سمجھتا کہ کسی طرح بھی تمہارا ممنون ہوں؟

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنی ٹوپی کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

یوئل نے نوجوان کا کوٹ پکڑ کر کہا" خدا کے لئے پانچ منٹ اور بیٹھ جائیے۔ میں آپ سے کوئی فیس نہیں مانگتا۔ آج رات ایک ڈیوک اور ایک خاتون کو آپس میں یہ کھیل کھیلنا تھا۔ خاتون تو پہنچ گئی ہیں لیکن ڈیوک صاحب اب تک تشریف نہیں لائے ان کے بغیر کھیل کیسے کھیلا جا سکتا ہے اس طرح کا واقعہ کبھی پہلے پیش نہیں آیا۔ اس میں میری

سخت بدنامی ہے۔ دربار میں یہ خبر پہنچی تو میری ناموری میں خلل آجائے گا۔ آپ چل کر ڈیوک کی جگہ لے لیجئے۔ اور مجھے اور اس خاتون کو اپنا شرمندۂ احسان بنایئے اگر خدانخواستہ آپ اس کے نشانے سے بچ گئے تو آپ اس پر احسان کر کے واپس یہاں تشریف لے آیئے۔"

سیوین نے گھبرا کر پوچھا "تم چاہتے ہو میں اس کی جان لوں؟"

یول نے کہا۔ یہ کیا ضروری ہے۔ ممکن ہے آپ اس کا نشانہ بن جائیں۔ آپ یہ بتایئے کہ آپ کو دونوں میں سے کون سی بات پسند ہے۔ چشم زدن میں ایک حسین خاتون کے ہاتھوں مر جانا یا ایک دریا میں پڑے سڑتے رہنا۔ جہاں اس بات کا خطرہ ساتھ لگا ہے کہ کوئی خدائی فوجدار آ کے آپ کو بچا نہ لے۔ کس قدر شرم کی بات ہے۔ میرے ہاں آپ کی تسلی کو یہ تو خیال ہو گا کہ آپ کی موت دل پسند صحبت میں واقع ہوئی ہے۔

سیوین نے کہا۔ "ممکن ہے میں جانبر ہونے کو ایک حسین عورت کے قتل پر ترجیح دوں۔ تمہیں تمہاری ایجاد مبارک ہو جس کی بدولت تم نے خدا جانے کتنے انسانوں کو پیش از وقت مار دیا ہے۔"

موجد بولا حضرت آپ بہت کج نگاہی سے کام لے رہے ہیں آپ کے الفاظ سے مجھے صدمہ پہنچا ہے۔ ذرا آپ غور تو فرمایئے۔ میں نے کس کو جا کر کہا کہ تم قبل از وقت مر جاؤ۔ میرے پاس تو وہی لوگ تشریف لاتے ہیں جنہوں نے مر جانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہوتا ہے۔ اس کا فائدہ کیا؟ یہ سنیئے! (جیب سے ایک پاکٹ بک نکال کر) یہ میرے بہی کھاتے کا حساب سنیئے۔ آج تک کل بیاسی فرمائشیں ہو چکی ہیں جن میں سے ۵۲ مردوں کی تھیں۔ اور تیس عورتوں کی۔ کل بیالیس بازیاں کھیل جا چکی ہیں۔ نتیجہ؟ بیالیس اموات۔ اب حضرت! اگر میرے مربیّ اپنا طریقہ مرگ خود سوچتے تو اموات کی تعداد اس سے قریباً دگنی ہوتی ہے نہیں؟ جناب عالی! میں تو مصلح بنی نوع انسان ہوں۔ میں تو جانیں بچاتا ہوں۔"

سیوین نے کہا "اور تمہیں اس بات کا خیال نہیں کہ جو لوگ تمہاری بازی کے بعد زندہ بچ جاتے ہیں۔ وہ پھر کسی اور طرح خودکشی کر لیتے ہیں۔"

"حضور مجھے معاف کیجئے، آپ پھر غلطی پر ہیں۔ پہلی اکتالیس بازیوں میں سے جو زندہ بچ گئے ممکن تھا کہ وہ پھر آپس میں یہ کھیل کھیلتے حتیٰ کہ ان میں سے صرف ایک باقی رہ جاتا۔ لیکن ہوا یوں کہ زندہ بچ جانے والوں میں سے صرف ایک نے دوبارہ مرنے کی خواہش کی۔ اس ایک کے ماسوا باقی سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور جاتے ہوئے میرا شکریہ ادا کرتے گئے۔ اندھیرے میں گولی کے چلنے کا ڈر، ایک مختصر مگر شدید انتظار مرگ۔ مجروح نعش کا گھناؤنا نظارہ۔ یہ ایسی ہیبت ناک باتیں ہیں کہ جو لوگ زندہ رہ جاتے ہیں وہ پھر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ مزاہے تو گھر میں جا کر طبعی موت مریں گے۔ حضور! اگر آپ چل کر اس خاتون کے سر پر تھوڑا سا احسان کر دیں۔ اور خوش قسمتی یا بدقسمتی سے آپ اس کی گولیوں سے بچ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں گے کہ آپ زندہ بچ گئے۔"

سیون نے کہا "میرے بات تو غلط ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ تمہاری باتیں بہت دلچسپ ہیں۔ مختصر یہ کہ میں یہ کھیل کھیلنے کو تیار ہوں بقول تمہارے زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ میری موت چند گھنٹے دیر میں آئے اور کیا؟"

یوّل بے انتہا مسرور ہوا اور بڑے پھّے دار فقروں میں شکریہ ادا کرنے لگا۔

سیون نے اس کی بات کو کاٹ کر کہا۔ "بل ادا کرو اور چلو چلیں۔ بہت وقت ضائع ہو چکا ہے"

شراب خانے سے نکلے تو یول آگے آگے چلنے لگا۔ چلتے چلتے وہ تنگ و تاریک گلیوں میں پہنچ گئے۔ جہاں کہیں کہیں ایک آویزاں لیمپ کی ناکام روشنی رات کی سیاہی کو اور بھی تاریک کر دیتی تھی۔ یول نہایت لسانی سے باتیں کرتا جاتا تھا شاید اس ڈر سے کہ کہیں اس کا ساتھی خاموشی سے گھبرا کر واپس ہو جانے کا ارادہ نہ کر لے۔ دن بھر کی تازہ خبروں پر تبصرہ کرتا رہا کبھی دربار شاہی کے معاملات پر اور کبھی تازہ ترین ڈرامے کے متعلق کہ فلاں ایکٹرس نے بہت بُری طرح ایکٹ کیا۔ اور گاتے وقت بے سُری ہو گئی۔ اور جب اس طرح کی باتیں ختم ہو چکیں تو اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اور چاند ستاروں کے متعلق ایک تقریر شروع کر دی۔ سیون بالکل خاموشی

سے سب کچھ سنتا رہا۔

کوئی بیس منٹ چلنے کے بعد وہ ایک کشادہ بازار میں پہنچے اور ایک کسی قدر بڑے گھر کے دروازے کے سامنے آکر ٹھہر گئے۔ یوُل نے ایک گھنٹی کی رسی کو پکڑ کر کھینچا۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے کی ایک کھڑکی میں سے کسی نے باہر کو جھانکا اور آواز آئی "کون ہے؟"

یوُل نے کہا۔ "میں ہوں دروازہ کھولو"۔

دروازہ کھلا اور یہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ یوُل نے پوچھا۔ "وہ خاتون ابھی یہیں ہیں؟" جواب ملا۔ "ہاں صاحب"۔ "ڈیوک آئے ہیں؟" جواب ملا۔ "نہیں صاحب"

یوُل نے اپنے ساتھی کی آستین پکڑ کر کہا۔ "آئیے"

دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک بربط دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ میز پر ایک رُباب رکھا تھا۔ اور کرسی پر ایک عورت سوئی پڑی تھی۔ شکل حسین نہ تھی۔

سیورن نے مایوس ہو کر پوچھا "کیا یہی وہ خاتون ہیں؟"

یوُل نے کہا۔ "نہیں صاحب! یہ تو بربط بجانے والی عورت ہے۔ انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گئی ہے۔ وہ خاتون تو ساتھ کے کمرے میں ہیں۔ آپ اپنی ٹوپی اور لبادہ اتار کر یہاں لٹکا دیجئے اور یہ ایک معمولی سی رسم ہے اسے بھی پورا کر دیجئے یعنی یہ نیم نقاب پہن لیجئے۔ گمنامی میرے یہاں کا سب سے مقدم اصول ہے۔ ٹھیک۔ ادھر کو تشریف لائیں"۔

ساتھ کا کمرہ پہلے کمرے سے بڑا تھا۔ فرنیچر تھوڑا۔ مگر جس قدر بھی تھا اچھا تھا۔ ایک دیوار تصویروں سے بالکل عاری تھی۔ انگیٹھی میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ اور آگ کے سامنے ایک عورت نہایت قیمتی لباس پہنے بیٹھی تھی۔ دروازہ کھلا تو وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کہنے لگی۔ "اب آ بھی چکو اتنی دیر کر دی تم نے۔ اگر میرا دل مضبوط نہ ہوتا تو میں کب کی واپس چلی گئی ہوتی"۔

یوُل نے کہا "بیگم صاحبہ میں تہہ دل سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مجھے کچھ مشکلات پیش آگئی تھیں جن کی وجہ سے میں رُک گیا۔ یہ میرے ساتھ جو صاحب ہیں۔ یہ ان بے وفا حضرت کی

قائم رکھیں گے جو آنے کا وعدہ کر کے نہیں آئے۔ اب قاعدے کی رو سے آپ کو آدھ گھنٹہ دیا جاتا ہے آپ اس میں ایک دوسرے سے واقفیت پیدا کر لیجئے۔ یاد نیلے کے لئے کوئی پیغام چھوڑنا ہو تو وہ لکھ ڈالیئے؟"

عورت نے اٹھ کر کہا "نہیں میں ضرورت سے زیادہ انتظار کر چکی ہوں۔ یہ ابھی اور انتظار کیا معنی؟ اجنبی صاحب اگر ہم قاعدے کی خلاف ورزی کر کے یہ آدھ گھنٹہ استعمال میں نہ لائیں تو آپ کو اس میں کیا اعتراض ہے؟"

سیورین نے کہا " سچ بات یہ ہے کہ تھوڑی دیر ہوئی میں فوراً اس دنیا سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا لیکن کچھ تو ان باتوں کا اور کچھ آپ کی ملاقات کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ مجھے تعجیل کا کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ آپ یہ آدھ گھنٹہ ٹھہر جائیے۔ مجھے آپ سے یہ درخواست کرنے کا حق نہیں کیونکہ آپ ہی نے میرے اصلی ارادے کو درہم برہم کر دیا ہے۔ آپ نہ ہوتیں تو میں اس وقت دریا کی تہ میں پڑا ہوتا یا بہہ کر سیورسے تک پہنچ گیا ہوتا!"

خاتون نے کہا جس طرح آپ کی مرضی ہو صاحب! لیکن افسوس کہ میں اس وقت اپنی رفاقت میں کوئی دل پذیری پیدا نہیں کر سکتی؟"

چند منٹ تک کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ جس میں سیورین اس حسینہ کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ نقاب نے چہرے کے بالائی حصے کو مستور کر رکھا تھا۔ لیکن پھر بھی ٹھوڑی کی گولائی، ہونٹوں کی کمان، چھوٹے چھوٹے کانوں کی خوب صورتی جو بالوں کے گھنگھریالے جال میں سے جھانک رہی تھی۔ اس بات کے لئے کافی تھیں کہ سیورین نقاب پوش حصے کے متعلق غور کرنے لگ جائے شاید خاتون بھی اسی طرح اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ بہر حال ان کی آنکھیں کبھی کبھی چار ہو جاتی تھیں۔

اتنے میں خاتون بولی" جناب! اگر ہمیں اپنی زندگی کے آخری لمحے اکٹھے ہی گذارنے ہیں تو ہنس کھیل کے ہی گذار دیں۔ دو گھنٹے خاموش بیٹھی رہی ہوں۔ ذرا میرے دل کو بہلنے دیجئے۔ خدا

کے لئے بات ہی کیجئے"

سیوین نے کہا "بیگم! بسر وچشم۔ کیا بات کروں۔ اچھا استعارے میں بات کرتا ہوں۔ جب میں ادھر کو آرہا تھا تو رستے میں پوآل ستاروں کے متعلق باتیں کرتا رہا تھا ایک طرف کو زہرہ دکھائی دے رہی تھی۔ پول نے مجھ سے کہا تھا "یہ زہرہ یہاں کیسے آگئی؟" اسی قسم کا ایک سوال اس وقت میرے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ زہرہ یہاں کیسے آگئی۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا دل باقی نہیں رہا جسے توڑا جاسکے کوئی ایسا انسان موجود نہیں جو حسن کا فریب کھاسکے۔ دلوں کو توڑنے کا مشغلہ اسی قدر دلچسپ ہے جس قدر یہ کھیل جو ہم کھیلنے والے ہیں۔ اس کی طرح اس میں بھی صرف ایک ہی آدمی مجروح ہوتا ہے۔ میں پھر پوچھوں گا کہ زہرہ یہاں کیسے آگئی؟"

خاتون نے جواب دیا "جناب معلوم ہوتا ہے آپ کو تشبیہوں کا بہت شوق ہے۔ یہ سوال آپ کسی اور وقت پوچھتے تو میں اس کو آپ کی دیدہ دلیری سمجھتی اور خاموشی کے سوا دوسرا جواب دینا گوارا نہ کرتی۔ لیکن اب چونکہ ہم میں سے ایک کو صرف آدھ گھنٹہ اور زندہ رہنا ہے میں سمجھتی ہوں کہ صاف گوئی سے کام لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ تو جناب زہرہ کے یہاں موجود ہونے کی وجہ عطارد ہے۔ جس کی ظاہرا" شکل وصورت تو ایک اچھے بھلے انسان کی تھی۔ لیکن دل دغا سے بھرا ہوا تھا"

سیوین نے کہا "اس کے اور حالات سے مجھے آگاہ کیجئے"

خاتون نے حقارت آمیز لہجے میں کہا "میں اس سے زیادہ کیوں بتلاؤں۔ میں راز کے بدلے راز کا اظہار کرسکتی ہوں۔ گمنام صاحب! آپ بتائیے۔ آپ یہاں کیوں تشریف لائے ہیں؟" (معاف کیجئے میں آپ کو کسی آسمانی نام سے نہیں پکارتی)

"بیگم صاحبہ! میرے یہاں آنے کا باعث حسن وخوبی کا ایک درخشندہ ستارہ ہوا ہے۔ جو میرے ساتھ قران میں آیا ہے اور کچھ عرصے تک میری ہمراہی میں گردش کرتا رہا۔ لیکن یہ ستارہ آخر میں آپ کے عطارد کی طرح کج رفتار نکلا۔ اب وہ ایک سپاہی کی آغوش میں چمک رہا ہے۔ یہ

دُنیا اس کے بغیر تاریک ہے اس لئے میں کسی دوسری دنیا میں جانا چاہتا ہوں"

"تو آپ سے ایسا سلوک پہلے کبھی نہیں ہوا؟"

"کبھی نہیں۔ اسی لئے میں نے قسم کھالی ہے کہ پھر اس طرح کا واقعہ کبھی پیش نہ آئے گا"

"آپ کے خیال میں وہ خاتون اس قابل ہے کہ اس کے لئے جان یوں قربان کر دی جائے"

"کیا آپ کا محبوب اس قابل ہے؟"

خاتون نے جوش میں آکر کہا" ہرگز نہیں، قطعاً نہیں۔ آپ یہ نہ سمجھئے کہ میں موت کو دل شکستہ کا مرہم جان کر اس کی طلب گار ہوں آپ کا شاید یہ خیال ہو۔ لیکن میں تو صرف اس لئے مرنا چاہتی ہوں کہ مبادا اور بادشاہی کے لوگ میری ہنسی اڑائیں۔ زندگی میں پہلے بھی ایک دفعہ مجھ سے یوں دغا کی گئی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تیسری دفعہ پھر یوں ہو! مرد جھوٹے اور بے وفا ہیں"

بات کو یہاں پہنچا کر دونوں غمزدہ نظروں سے آگ کے شعلوں کو دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد سیوین نے کہا۔"بیگم صاحبہ! زندگی کی چند گھڑیاں باقی ہیں۔ آپ میری اتنی بات مان لیجئے کہ اپنا نقاب اتار کر مجھے اپنا چہرہ دکھا دیجئے"

خاتون نے نہایت بے پروائی سے کہا"کیوں؟"

میری آرزو ہے کہ میں اس خاتون کی شکل دیکھ لوں۔ جو ابھی مجھے دوسری دنیا میں بھیج دے گی یا مجھ سے چند منٹ پہلے وہاں جا پہنچے گی"

جواب ملا"فضول تمنا ہے، آپ کو چاہیئے کہ اس وقت آپ اپنے دل کو اعلیٰ وارفع خیالات میں مصروف رکھیں"

سیوین نے کہا"بیگم صاحبہ! یہ نہ کہیئے۔ ابھی ابھی مجھ سے یول نے کہا تھا کہ انسان ایک حیوان متمدن ہے۔ ہم ایک طویل سفر کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور اگر میں اپنے ہم سفر کی شکل دیکھنا چاہوں۔ تو یہ کون سی تعجب کی بات ہے۔ معاف کیجئے۔ آپ کو میرا شرمندۂ احسان ہونا چاہیئے۔ آپ نہ ہوتیں تو میری تکلیف کا اب تک خاتمہ ہو گیا ہوتا اور پھر ا   کی گولی کا نشانہ

بننا یا آپ کو اپنا نشانہ بنانا کوئی معمولی سی بات ہے؟ ـــــ مجھے اپنی شکل دکھا دیجئے"

کچھ دیر تک وہ تامل میں رہی۔ پھر کہنے لگی "جناب فی الحقیقت بقول آپ کے میں آپ کی احسان مند ہوں۔ آپ کا حکم ماننے کے بغیر چارہ نہیں۔ آپ بھی اپنا نقاب اتار دیجئے"

دونوں نے اپنے نقاب اتار دیئے اور دونوں غور سے ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ سیوین خوش شکل تھا لیکن بے نقابی نے خاتون کے چہرے کے حسن کو آشکار کر دیا تھا سیوین کی توقعات سے بالا تھا۔ باریک نفیس ابرو جیسے کسی خوش مذاق مصور کی قلم طرازی، نیلی نیلی خوبصورت آنکھیں، لمبی لمبی سجیلی پلکیں، آنکھوں کی نیلگوں گہرائی۔ سیوین کا دل دھڑکنے لگا۔

خاتون نے کہا "کیا آپ کو میرے چہرے میں کوئی ایسی قباحت نظر آتی ہے۔ جس کی وجہ سے دوسرو مجھ سے یوں منہ پھیرلیں"

سیوین نے کہا "جو کچھ آنکھوں کو نظر آرہا ہے اس سے تو ایک تیسرا شخص بھی مسحور ہو سکتا ہے۔ اگر ان دونوں نے آپ سے بے وفائی کی تو اس کی وجہ اس موہنی صورت میں مجھے کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ کیا انہوں نے کوئی اور وجہ نہیں بتائی؟"

ایک بے وفا کو میرا افلاس ناگوار تھا۔ جب میرے والد کے ساتھ ہی میرا تمول بھی رخصت ہو گیا اور ناداری نے مجھے آن گھیرا۔ تو میرا چھبیلا ایک دن مجھ سے ملنے آیا عشق و محبت کی داستان رک رک کے اور تھم تھم کے مجھ سے کہتا رہا۔ آواز میں عجز تھا۔ انداز میں انکسار تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ گیا کہ میں محض اپنی آمدنی پر گھر بار کے اخراجات کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ حضرت میرے جہیز کی ہوس میں منہ کھولے بیٹھے تھے۔ دور اندیش واقع ہوئے تھے"

سیوین نے جیسے ایک درد محسوس کر کے کہا" او خدا ایسی شکل کو دیکھنا اور پھر دور اندیش رہنا۔ اور آپ کے عشق کا دوسرا شعلہ۔ آپ کا عطارد۔ وہ بھی دور اندیش تھا؟"

"نہیں اب میں دولت مند ہوں چچا کے مرجانے کے بعد مجھے بہت کچھ ورثے میں ملا۔ میرے سورما کا دل اور شمشیر چھ مہینے تک میری قدم بوسی کرتے رہے۔ لیکن آہ میں کیا کہوں۔

جوانمرد سپاہی ایسے نہیں ہوا کرتے۔ یکایک انہوں نے حسن کا معیار بدل لیا۔ ذرا آپ کا عذر ملاحظہ فرمائیے۔ میری دردمندی کا بھی خیال کیجئے۔ مجھ کو آپ لکھتے ہیں۔ "رنگ کے بارے میں میرے خیالات کچھ بدل گئے ہیں"۔ اب تک وہ اندھا تھا ایک نئی قوت نے اسے بصارت بخشی۔ اب اسے نیلی آنکھوں کی بجائے بھوری آنکھیں اچھی لگتی ہیں"۔

سیمون نے کہا "یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے لیکن نہیں بیگم صاحبہ یوں ہو سکتا ہے۔ اس سے بیشتر مجھے بھورا رنگ دنیا کے تمام رنگوں سے پیارا معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر ہوئی میں نے اپنا مذہب بدل ڈالا۔ اب میں نیلے رنگ کی قسم کھایا کروں گا"۔

"حضرت آپ اسی بھورے رنگ کا ذکر کر رہے ہیں جس کی خاطر آپ ایک گھنٹہ پہلے جان دینے کو تیار تھے ؟"

"بیگم صاحبہ میں شاعر ہوں۔ جس بے رحم عورت کی خاطر میں آج جان دینے والا تھا اس کی صورت میں مجھے تمام محاسن سب کے سب خوبیاں نظر آتی تھیں۔ میں نے اس کی تعریف میں قصیدے لکھ لکھ کر گائے ہیں۔ لیکن اب مجھے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہ میری جہالت کا نتیجہ تھا۔ میں گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ اور مجھے شہر سے نفرت تھی اب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا ہے میں اسے تمام عورتوں سے بڑھ کر حسین جانتا تھا۔ اس لئے کہ میں نے ابھی آپ کو دیکھا نہ تھا"۔

نفرت آمیز جواب ملا کہ "شاعر صاحب کیا کہنے ؛ آپ بھی اور مردوں کی طرح ہر لحظہ بدلنے والے ہیں۔ آپ بھورے رنگ کی پرستش کرتے ہیں۔ اس کے لئے جان دینے کو تیار ہیں اور بمشکل ایک گھنٹہ گزرنے پاتا ہے کہ آپ کو نیلا رنگ موہ لیتا ہے۔ شاید آپ نیلے رنگ کے لئے بھی جان دینے کو تیار ہو جائیں"۔

سیمون نے کہا۔ میں نیلے رنگ کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں یہ نیلی آنکھیں مجھے التفات کی نظر بخشیں تو یہی زندگی جنت ہو سکتی ہے"۔ خاتون طنزاً ہنس دی اور کہنے لگی۔

"جناب آپ یقین مانیئے کہ نیلا رنگ کبھی مہربان نہیں ہو سکتا۔ آپ شاعر لوگ سمندر کو نیلا

کہتے ہیں لیکن اس کی لہریں غرق وفنا کر سکتی ہیں۔ آسمان نیلگوں ہے لیکن اس کی بجلیاں تاراج کر سکتی ہیں۔ اور ابھی میں آپ کو دکھادوں گی کہ نیلی آنکھیں پستول کا نشانہ بھی لگا سکتی ہیں"
سیوین نے آہستہ سے کہا "آپ کو شاید یاد نہیں کہ پستول اندھیرے میں چلانا ہوگا"
خاتون نے جوش میں آکر کہا "میں بہت ہی خوش ہوں کہ آپ تشریف لے آئے۔ آپ کو مار دینے سے مجھے بہت ہی مسرت حاصل ہوگی"
شاعر نے کہا "اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ دور اندیش صاحب نے اور عطارد نے کیوں آپ سے بے اعتنائی کی۔ بیگم صاحبہ! یہ برہم مزاجی نیلی آنکھوں کو نہیں سجتی۔ آپ بہت بے رحم ہیں۔ لیکن آپ کے عطارد کا دل معلوم ہوتا ہے شعریت سے بالکل مبرا تھا آپ کا عتاب میں بگڑنا آپ میں جو حسن پیدا کر دیتا ہے وہ اسے دیکھ نہ سکتا تھا۔ ان نیلی آنکھوں میں جب غصہ چمک آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آسمان کی نیلگوں گہرائیوں کے ایک تلاطم میں کہیں سورج نظر آرہا ہے پھر اس پر بادل گھر کر آجاتے ہیں پھر کسی نانہ سے بجلیاں چمکتی ہیں پھر شاید چند بوندیں بھی ٹپک پڑتی ہیں۔ اور پھر سورج اپنا رخ تاباں بے نقاب کر دیتا ہے جس نے اس روح افزا نظارے کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں وہ حسن کی کس طرح قدر کر سکتا ہے۔ لیکن بیگم صاحبہ اگر میں آج رات زندہ بچ جاؤں تو ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا جو آپ کے ساتھ بے وفائی کر گئے ہیں۔ کف افسوس ملیں۔ آپ کو فردوس کی پرفضا گلگشتوں میں مسرت ہو کہ اسے کاش میں اس بے چارے شاعر کی پرستش قبول کر لیتی اور زندہ رہتی۔ اس وقت شہرۂ آفاق ہوتی"
اس تقریر کے دوران میں خاتون اس کے چہرے کا نہایت غور سے مطالعہ کرتی رہی۔ آخر بولی سبحان اللہ! کیا فصاحت ہے۔ کیا شاعر احمق ہوتے ہیں۔ کیوں صاحب! کوئی شخص آپ کی نظموں کو چھاپنا بھی گوارا کرتا ہے؟
شاعر نے فخر وغرور سے کہا "بیگم صاحبہ میرا نام ایڈمنڈ سیوین ہے"
"کون سیوین۔ مان کا تو کا رہنے والا؟"

شاعر نے کہا "میں وہی ہوں۔ آپ کو میری نظموں میں سے کون سی پسند ہے۔ 'حسن شیریں' 'عشقِ لیلےٰ'؟"

"نظمیں؟ میں نے نظمیں کبھی نہیں پڑھیں! شاعر سیوین کا نام میں نے آج سے پیشتر کبھی نہیں سنا۔ کیا آپ کی محبوبہ اس بھوری آنکھوں والی کا نام ڈوریا ہے؟"

"ہاں ہاں۔ مگر آپ اسے کیونکر جانتی ہیں؟"

"میرا کپتان، میرا سورما، میرا اعطارد مال کانٹو میں اسے اپنا دل دے چکا ہے۔ مجھے اس نے خط میں لکھا تھا کہ وہ پہلے سیوین نامی ایک مجنوں شاعر کی دلدادہ تھی۔ اب وہ ایک جنگجو بہادر سپاہی کو ترجیح دیتی ہے۔ میرا اعطارد مشہور خطوط باز ہے۔ خط بہت مفصل لکھا کرتا ہے۔"

غصے سے سیوین کا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ بے تاب ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ آخر کار بولا۔

"تو بیگم صاحبہ آپ ہی ہیں۔ جنہوں نے بے دردی سے میری خوشی، میری راحت مجھ سے چھنوادی ہے۔ اگر آپ اپنے اس سورما کو اپنے پاس سنبھال کر رکھتیں تو میں اپنی زندگی مسرت اور اطمینان سے گذارتا۔ میں شہر ایک ضروری کام کے لئے آیا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ میری عدم موجودگی میں میری دولت کو یوں ایک لٹیرا آ کر لوٹ جائے گا۔"

اس نے اتنا کہا اور ٹہل کر کمرہ کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چلا گیا۔ وہاں سے مڑ کر اس نے اپنی نظریں اس خاتون کے چہرے پر گاڑ دیں۔ گرمی تقریر سے خاتون کے چہرے پر ایک سرخی جھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نور چمک رہا تھا۔ اس کے حسن کا طلسم پہلے سے بھی زیادہ ہوش رُبا تھا۔

رعبِ حسن اور اس پر شاعر کی نگاہ، سیوین کی پلکوں کو انکسار نے جھکا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا ——— وہ ایک پیکرِ التجا ہو کر بولا ———

بیگم کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے سورما کو بھلا دیں اور میں اپنی بے وفا محبوبہ کو بھول جاؤں اور ——— "

"اور کیا ؟"

"اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ہو جائیں"

خاتون نے ایک قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستی رہی ۔ اتنی دیر تک کہ سیمون توہین محسوس کرنے لگا۔ کہنے لگی۔

"شاعر صاحب! مجھ سے آپ کے عشق کی پائیداری کو تو نہیں سراہا جا سکتا البتہ میں آپ کی جدّتِ طبع کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتی ۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی اس دانشمندانہ تجویز کو قبول نہیں کر سکتی ۔ میں نے سچے عشق کی پہچان الفاظ سے کرنی چھوڑ دی ہے ۔ جو مجھ سے شادی کرنا چاہے اسے کچھ کر کے بتانا پڑے گا ۔ میں اپنا دل کسی ایسے آدمی کو نہیں دے سکتی جو آج تو نیلی آنکھوں پر مرتا ہے اور پھر قوسِ قزح کے ساتوں رنگ باری باری اسے اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں ۔ مجھ سے ایسی حماقت نہیں ہو سکتی ۔ اور چونکہ ایسے شخص کا ملنا ناممکن ہے —— اس لئے ۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور یوَل اندر داخل ہوا ۔ دونوں کو بے نقاب دیکھ کر چونکا اور کسی قدر درشتی سے کہنے لگا "یہ سخت بے قاعدگی ہے ۔ آپ ازراہِ نوازش اپنا اپنا نقاب پہن لیجئے"

خاتون نے کہا "اب کیا ہے؟ اب تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا ہے ۔ یوَل تمہیں جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو ۔ یہ صاحب تو ایسے خشک گفتار ہیں جیسے کوئی واعظ ہوں ۔ آپ شاعر ہیں سب مجھے شاعروں سے نفرت ہے ۔ میں شاعروں کو گولی سے بھی مار سکتی ہوں"

یوَل نے ایک تھیلی آگے بڑھا کر کہا ۔ "اس میں کپڑے کی بہت سی چھوٹی بڑی کترنیں ہیں ۔ آپ ایک ایک کترن نکال لیجئے ۔ جس کے حصے میں چھوٹی کترن آئے گی اسے شیر بننا پڑے گا"

خاتون نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کپڑے کا ایک ٹکڑا نکال لیا ۔

سیمون نے بھی اپنی قسمت آزمائی کی ۔ کترنوں کو ایک ساتھ رکھ کر ماپا گیا ۔

خاتون پکار اٹھی ۔ "میں شکاری ہوں"

سیمون نے کہا ۔ اور میں شیر ہوں ۔ بیگم صاحبہ! گولی بالکل سیدھی چلائیے ۔ یہ جھگڑا جلد پاک

ہو جائے گا"

یول نے کہا"یہ دیکھیئے۔ یہ گھنٹی ہے۔ اسے اپنے گلے میں لٹکا لیجیئے اور ہلا کے دیکھ لیجیئے ٹھیک بجتی ہے یا نہیں۔ ٹھیک۔ بیگم صاحبہ یہ پستول۔ اس میں کسی طرح کا نقص نہیں۔ صاحب آپ اس دیوار کے سامنے ہی رہیئے اور جس وقت موسیقی بند ہو جائے تو آپ دو تین قدم چلئے اور گھنٹی کو بجنے دیجئے اور بیگم صاحبہ آپ جس وقت گھنٹی کی آواز سنیں فوراً پستول چلا دیں لیجیئے آداب عرض ہے۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ خدا کرے آپ کا سفر جلدی سے طے ہو جائے اور آپ کی منزل خوشگوار و دلپذیر ہو۔ صاحب آپ کو کس طرح کی موسیقی چاہیئے"

سیوین نے کہا"کوئی دردناک سا شر بجاؤ۔ جس میں امیدوں کا خاک میں مل جانا ہو۔ جس میں نیلی آنکھوں کی سفاکی ہو۔ جس میں ایک درد بھرے دل کا نالہ ہو۔ ایک بے رحم شکاری کے شکار کی آہ و زاری ہو۔ بیگم صاحبہ! لیجیئے جو انتقام آپ کو مردوں کی جنس سے لینا ہے۔ وہ مجھ اکیلے کی ذات سے لے لیجیئے"

یول نے طاق پر رکھی ہوئی شمعیں بجھا دیں۔ انگیٹھی کی آگ کے سامنے لوہے کا ایک تختہ رکھ دیا۔ پھر میز کا لیمپ اٹھا کر باہر چلا گیا۔ جب دروازہ بند ہو گیا تو کمرے میں بالکل اندھیرا تھا ساتھ کے کمرے سے بربط اور رباب کی دردناک موسیقی نے فضا میں ایک بے تابی پیدا کر دی۔ تین منٹ تک یہی حالت رہی اس کے بعد موسیقی بند ہو گئی۔

محیط تاریکی اور خاموشی میں گھنٹی کی نقرئی آواز بالکل صاف سنائی دی۔ پستول کی ایک گولی چل گئی۔ دوبارہ گھنٹی بجی۔ ایک اور گولی چلائی گئی۔ یول لیمپ ہاتھ میں اٹھائے اندر داخل ہوا۔ پستول خاتون کے ہاتھ میں تھا۔ نالی میں سے دھواں ابھی نکل رہا تھا۔ سیوین ویسے کا ویسا کھڑا تھا۔

یول نے دیوار پر نظر ڈال کر کہا"گولیوں کے نشان کہاں ہیں؟ وہ ہیں دو سوراخ۔ بیگم صاحبہ آپ کا نشانہ بہت ہی غلط تھا۔ اب صاحب آپ گھنٹی بیگم صاحبہ کو دے دیجئے۔ اور میں پستول

ابھی آپ کو بھر کے لا دیتا ہوں "

یوں کہنے میں میز کے پاس کھڑا ہو کر پستول بھرنے لگا۔ شاعر نے کہا

"بیگم صاحبہ! آپ نے پستول بہت اوپنچا چلا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ میرے دل میں اتنا رحم نہیں۔ میری ایک نہ ایک گولی ضرور جھلک جگی"۔

خاتون نے کہا "شاعر صاحب یہی تو میری تمنا ہے"

یوں نے پستول بھر کر سیوین کو دے دیا۔ خاتون سے پوچھا "آپ کو کس طرح کی موسیقی چاہیئے؟"

جواب ملا۔ کوئی بے پروا سی چیز بجا دو۔ درد ناک سُر مجھے نہیں بھاتے

دروازہ بند ہو گیا۔ اور ایک ایک لمحے کے بعد اس تاریکی میں ایک ہنستا کھیلتا سُر سنائی دیا۔

آخر وہ بھی بند ہو گیا۔

ایک گھنٹی کی آواز آئی۔

ایک گولی چلی۔

صیدنے آواز دی "شاعر صاحب! پستول ذرا سا نیچے کر کے چلائیے"

صیاد نے کہا "نیلے نیناں والی خدا حافظ"

اندھیرے میں ایک ہنستی ہوئی آواز نے جواب دیا " بے وفا شاعر خدا حافظ" اور پھر گھنٹی بجی۔ ایک فائر ہوا۔ ایک چیخ سنائی دی کوئی زمین پر جیسے گرا۔

یوں روشنی لے کر اندر آیا۔ خاتون اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ سیوین کے ہاتھ میں پستول تھا۔ خود فرش پر پڑا تھا۔

خاتون نے ایک چیخ ماری اور گرتی پڑتی سیوین کے پاس پہنچ گئی۔ چلا چلا کر کہتی رہی۔ میرے شاعر میرے پیارے شاعر! تو نے اپنے آپ کو کیوں مار ڈالا۔ ہائے کس انداز سے تو نے خدا حافظ کہا تھا۔ اور میں نے یونہی تیرا مضحکہ اڑا دیا۔ میرے خوبصورت شاعر تو کیوں گیا؟"

یول نے شبہ کی نظروں سے دیوار کو دیکھ کر کہا۔ لیکن وہ کیسے مر سکتا ہے؟ کارتوس تو خالی تھا!"

"کیا کہا تم نے؟"

میرا خیال ہے میں نے آپ سے ذکر بھی کیا تھا۔ کہ میں کبھی کبھی ایک خالی کارتوس بھر دیا کرتا ہوں۔ پہلا کارتوس جو چلایا گیا اس کا نشان تو دیوار پر موجود ہے اس لیے دوسرا کارتوس خالی ہوگا۔ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کارتوس خالی ہے۔ یہ مر کیسے سکتے ہیں؟ صرف بے ہوش ہو گئے ہیں! وہ بھی نہیں۔ دیکھئے۔ ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں!"

سیوین نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ حسن عشق کے انداز میں نیاز مند ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا "تو گویا میں جنت میں پہنچ گیا ہوں۔ تم بھی یہاں ہو۔ او خدا میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں"

خاتون نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ہٹایا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی "نہیں میرے صاحب! ہم ابھی پیرس میں ہیں"

"پیرس میں؟ کیا کہا تم نے؟ پیرس میں! کیا لغو بات ہے؟" سیوین اٹھ کر بیٹھ گیا "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں نے اپنے دل پر پستول چلایا تھا۔ یہ دیکھو بارود کا نشان اس بات کا شاہد ہے"

یول بولا "وہ خالی کارتوس تھا۔ آپ کو نئے سرے سے کھیل شروع کرنا پڑے گا۔ بیگم صاحبہ! اب آپ کے شکاری بننے کی باری ہے"

خاتون نے کہا "اب مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں تنگ آ گئی ہوں۔ برائے مہربانی مجھے ایک گاڑی منگوا دیجئے۔ مجھے آج ہی ورسیلز پہنچنا ہے"

یول نے کہا "بیگم صاحبہ یہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی تو کھیل شروع ہی ہوا ہے۔ دیکھئے ایک ایک دو گھونٹ سے آپ کا خون ابھی پھر گرم ہو جائے گا۔ یہ پی لیجئے"

"صاحب آپ مجھے فوراً گاڑی منگوا دیجئے۔ آپ سنتے ہیں؟"

یول مایوس ہو کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ سیوین آہستہ آہستہ فرش پر سے اٹھا۔ خاتون نے

پوچھا "میرے اچھے صاحب! مجھے ایک بات بتا دیجئے۔ آپ نے مجھ پر گولی کیوں نہ چلائی؟"

تم میرے عشق کی سچائی کا ثبوت مانگتی تھیں۔ میں یہی کر سکتا تھا کہ تمہارے لئے اپنی جان دے دوں! افسوس وہ بھی نہ ہوا"

خاتون نے بڑی ملائمت سے کہا "یہ آپ کیا جانیں؟" اور پھر خاموش ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد بولی "میرا نام دن نینیز ہے۔ میں ملکہ کی درباریوں میں سے ہوں۔ کیا آپ اتنی تکلیف گوارا کر سکتے ہیں کہ کل دوپہر کے بعد ورسیلز میں آ کر مجھ سے ملیں۔ میں آپ کے شعر آپ کے منہ سے سنوں گی۔ اور پھر —"

"اور پھر کیا؟"

"اور پھر میرے شاعر! ہم ستاروں ہی ستاروں کی باتیں کریں گے"

شاعر نے پوچھا "ان دو نیلے ستاروں کی جو اس وقت مجھ پر چمک رہے ہیں؟"

خاتون نے نوجوان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کہا "یونہی سہی"۔

(ماخوذ از فرانسی)

"پطرس"
(مخزن اکتوبر ۱۹۲۱ء)

تنقیدی مضامین

ہمارے زمانے کا اُردو ادیب

ترجمہ: مظفر علی سید

پطرس مرحوم نے یہ مقالہ ۱۹۴۵ء میں پی ای این کے سالانہ اجلاس منعقدہ جے پور میں پڑھا تھا۔ اس میں انہوں نے اردو ادب کے جدید دور یعنی اقبال کے فوراً بعد کے زمانے کو موضوع بنایا تھا۔ اور اپنے مخصوص چبھتے ہوئے انداز میں اس پر رائے زنی کی تھی۔ اس مضمون کی اصلی خوبی تو ان کی انگریزی انشاء پردازی ہے جس کا اردو ترجمہ وہ خود ہی کرتے تو کرتے۔ زیرِ نظر ترجمہ محض اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ لوگ بھی جو انگریزی سے زیادہ واقف نہیں۔ ان کے اندازِ نظر اور جدید اردو ادب کے بارے میں ان کے نقطۂ خیال سے واقف ہو جائیں۔

چونکہ پطرس مرحوم کا اپنا تعلق اس دور کے ادب سے دوگونہ تھا نئے ادیب کی حیثیت سے اور اس سے بھی زیادہ نئے ادیبوں کے استاد کی حیثیت سے، اس لئے اس مقالے کی "معروضیت" اور "بے لاگ مطالعہ" شاید عجیب معلوم ہو پطرس نے اپنے نوجوان ساتھیوں کو ایک پہاڑی پر چڑھ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ دیہ الگ بات کہ وہ ایک عزیزوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں، اور اُن پر ہلکی ہلکی کنکریاں بھی پھینکی ہیں۔

ممکن ہے آپ اس مضمون کو محض تبرک سمجھیں مگر واقعہ یہ ہے کہ چند ایک
ٹکڑے اس میں ہر لحاظ سے اچھے ہیں۔

گیارہ سال پہلے جب اقبال اپنے اسلاف سے عالم بالا میں جا کر ملے تو دور و نزدیک کے زمانوں سے کئی ایک دوست ان کے گرد اکٹھے ہوئے۔ غالبؔ اور میرؔ، حالیؔ، شبلیؔ اور گرامیؔ حتیٰ کہ نظیریؔ اور رومیؔ اور حافظؔ بھی۔ چنانچہ گفتگو روانی سے ہونے لگی۔ کچھ لمحے گو مگو کی حالت میں بھی گزرے مثلاً جب خودی کے مسئلے پر ایک عالمانہ بحث رومیؔ اور اقبالؔ کے درمیان شروع ہوئی تو باقی لوگ اونگھنے لگے۔ اور تقدیرِ امم پر اقبال کی تنہا کلامی کے دوران میں تو غالب کے خراٹے بھی سنائی دیئے۔ مگر مجموعی طور پر یہ صحبت بعید ساز گار رہی۔ جانے پہچانے اقتباسات، کتابوں سے یا حافظے سے باآواز بلند پڑھے گئے اور شب و روز کی بے زبان لہروں پر حکمت و ظرافت کا ملاپ ہوتا رہا۔ بہت سے قضیے سامنے آئے اور ان میں سے کئی ایک حل نہ ہو سکے۔ اس کے باوجود فہم و بصیرت کے تازہ اور فرح بخش نقش و نگار دریافت ہوئے۔ اقبال قدماء میں سے نہ تھے پھر بھی قدماء کے لئے اجنبی نہ تھے بس ذرا سے نئے اور بھرپور سے لگتے تھے۔

آج کا نوجوان اردو ادیب، اگر اس کو اس سفر پر وقت سے پہلے روانہ ہونا پڑے۔ اس محفل میں کیسا لگے گا؟ مجھے یقین ہے کہ اس کا استقبال مروّت اور شفقت سے کیا جائے گا۔ مگر یہ خوف بھی ہے کہ وہ ذرا کھویا کھویا سا لگے گا۔ قدماء سے اظہارِ خیال اس کے لئے آسان نہیں ہوگا۔ نیا مسافر اپنے اور ان پیشروؤں کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل پائے گا جسے پاٹنے کے لئے اس کو کتب خانہ فردوس میں طویل نشستوں کا پروگرام بنانا پڑے گا۔ وہ حالات کی مجبوری سے اپنے اجداد کا جائز ورثہ وصول نہیں کر سکا۔ اِلا ماشاء اللہ راشد اور فیض، فراق اور فرحت اللہ بیگ، جوش اور حفیظ۔ ماضی کے ساتھ ان سب کے مراسم اچھے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اپنے آپ کو حال یا

مستقبل کے ساتھ وابستہ کرر کھا ہے۔ مگر وہ بہم ہم ہوتی ہوئی اقلیت سے تعلق رکھتے ہیں اور سلف کی ایسی یادگار ہیں جو تمہانے پھر کب پیدا ہو ہمارے لکھنے والوں کی اکثریت اپنے آپ روایات سے دور ہوتی جارہی ہے۔ مولوی نذیر احمد جو آج سے پچاس برس پہلے کے ناول نگار تھے، انبیاء کے اقوال کو احترام سے اور شعراء کے اقوال کو کراہت کے ساتھ نقل کرتے تھے۔ ان کا ولین انبیاء کو کراہت اور شعراء کو لذت کے ساتھ نقل کرتا تھا۔ مگر بات یہ ہے کہ مصنف اور اس کے کردار دونوں میں حوالہ دینے کی اہلیت تھی، دونوں نے ادب کی ایک مشترک دولت ورثے میں پائی تھی جو اس دور کے ذہنوں میں صاف ترتیب کے ساتھ موجود تھی۔ آج کے اردو ناول نگاریں اور اس کے ہیرو میں کوئی بات مشترک ہے تو یہ ہے کہ دونوں کوئی قول نقل نہیں کر سکتے۔ یہ نہیں کہ وہ پڑھتا نہیں۔ وہ بلا نوش قسم کا قاری ہے۔ مگر لائق ناشروں کی چھاپی ہوئی بہار کی فہرستِ خزاں کی فہرست اور سمندر پار کے ایڈیشن کچھ ایسے تسلسل کے ساتھ چلے آتے ہیں کہ چننے اور چھانٹنے کی فرصت رہ جاتی ہے نہ کسی چیز کو دوبارہ پڑھنے کی۔ ہمارے دور کا نصابِ بھی الجھا ہوا ہے اور پیچھے مڑکے دیکھنے کی تو تحریک ہی پیدا نہیں ہوتی۔ ہمارے زمانے کے اردو ادیب کا مستقبل ہو تو ہو ماضی کوئی نہیں۔

اس قطع تعلق کی وجوہات گوناگوں اور پیچیدہ ہیں۔ اوپری نظر سے دیکھیں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب نے جس نظامِ تعلیم کے تحت نشو و نما پائی ہے۔ یہ سب اسی کا قصور ہے۔ رسمی تعلیم پچھلے پچاس ایک سال میں شرافت اور (یا تقدس کے اس قدیم تصور سے دور ہٹ گئی ہے جو طالب علم کو اس دنیا اور) یا اس دنیا کے لئے انبیاء و شعراء کی مناسب مقدار کی مدد سے تیار کرتا تھا۔ پرانے مسلمات غائب ہو چکے ہیں اور اس کے ساتھ انبیاءٔ و شعراءُ بھی۔ یہی ایک کارنامہ ہے جو ہمارے نظامِ تعلیم نے سرانجام دیا ہے۔ باقی اس عرصے میں ہماری تعلیم ایک نئے تصوّر کی تلاش میں جو پرانے تصوّر کی جگہ لے سکے، تجربوں یا ٹاکم ٹوئیوں کا ایک سلسلہ ہے اور یہ ٹاکم ٹوئیاں اب بھی جاری ہیں۔

مگر یہ خیال پوری طرح نہیں۔ بنیادی وجوہ اس سے کہیں زیادہ گہری ہیں دنیا بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے اور لکھنے والا بھی نئی نسل کی طرح اس بڑھتے ہوئے پھیلاؤ کو محسوس کرتا ہے۔ اس نصف صدی میں بہت سے بندھن اور رشتے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ روایتی اقدار جو معاشرے کو بقا اور استحکام بخشتی تھیں، اسی وقت تک کارآمد تھیں جب معاشرے کا ناک نقشہ درست تھا۔ ناک نقشہ پھیل پھیل کر یوں متزلزل ہوگیا ہے جیسے پانی کی سطح پر تیل کے لہریے۔ قدیم معاشرے سے اس کا کوئی ربط نہیں، کیونکہ قدیم معاشرہ باقی نہیں رہا۔ وہ اپنے آپ کو ایک نئے اور ہر لحظہ بدلتے ہوئے معاشرے میں گھرا ہوا دیکھتا ہے جس سے مربوط ہونا اس کے لئے لازم ہے۔ اگر وہ بالکل ہی کٹ کے رہ جانا نہیں چاہتا۔ وہ پوری طرح اس کا شعور نہیں رکھتا مگر یہ بات اس کو معلوم ہو چکی ہے کہ پچھلی نسل نے اس کو کچھ نہیں دیا۔ نئی دنیا میں کوئی مناسب مقام اس کو حاصل کرنا ہے۔ ماضی کی کئی چیزیں اس کو ایسا کرنے سے روکتی ہیں۔ اور وہ ماضی مردہ باد کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس لئے نئی پود کا سب سے بڑا تقاضا بغاوت ہے۔ رسم و رواج کے خلاف قوت اور اختیار کے خلاف، والدین اور پولیس کے خلاف۔ وہ قدیم انبیا اور شعرا دونوں سے دور بھاگتا ہے بلکہ ہر اس چیز سے جو اسے ماضی کی یاد دلائے۔ یہ جنگ کبھی ابھار دھندلی اور غیر واضح سی ہو جاتی ہے اور پرکار کے نقطے آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ مگر خیر ایسا تو ہر جنگ میں ہوتا ہے۔

اردو ادیب کو اپنے ماضی سے قطع تعلق کر کے کم سے کم ایک بڑی قربانی تو دینی پڑی ہے۔ وہ بیک جنبش قلم الفاظ و تلمیحات اور حکایات و علائم کے ذخیرے سے، جو فن کار مصنف کو ناک اور کارآمد ترین آلات اظہار بخشتا ہے، محروم ہو گیا ہے۔ لفظ محض چند آوازوں اور لکیروں کا نام نہیں جو مٹ جانے کے بعد بھر پیدا کی جا سکیں۔ ان میں ہمارے پیشروؤں کی جذباتی واردات اور نفسیاتی مشاہدات مضمر ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک

انسانی تجربے کے طیف میں ایک خط کا حکم رکھتا ہے۔ اگر طیف کا ایک خط کم ہو جائے تو ہم اس کی جگہ دوسرا خط نہیں کھینچ سکتے۔ اسی پہلے خط کو پھر سے دریافت کرنا پڑے گا آج کے لکھنے والے کو اس وجہ سے نئی چیزوں کو نئے نام دینے ہیں۔ اسے ان چیزوں کو جو پہلے معلوم و محسوس تھیں پھر سے جاننا اور پہچاننا ہے۔ ماضی سے دست بردار ہو کر اس نے اپنی تخلیقی شخصیت پہ ایک بوجھ ڈال دیا ہے جس سے اس کی فنی مشکلات دوچند ہو گئی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم اس کو بیک وقت نازک اور اکھڑ واضح اور دھندلا گومگو میں گرفتار اور ہزار معنوں میں مضطرب دیکھتے ہیں۔ لفظ جن سے اس نے پہلو تہی برتی تھی اب اس سے پہلو چراتے ہیں (مر) ڈینی سن روس نے، جو اس بات سے واقف تھے کہ زندہ زبانوں میں تلمیحات اور حوالوں کا ایک ذخیرہ مخفی ہوتا ہے جسے تعلیم یافتہ افراد اپنا کر اپنی تحریر و تقریر میں رنگ اور زور پیدا کرتے ہیں۔ چند سال پہلے ایک کتاب کی صورت میں انگریزی زبان کے پس منظر کا نقشہ کھینچا تھا۔ ادبی حوالوں کے زیرِ عنوان انہوں نے بائبل کے مستند ترجمے کا، شیکسپیئر کا اور بچوں کے گیتوں کا تذکرہ کیا تھا اور "انگریزی روایت" کے تحت قومی تہوار۔ معروف شخصیتوں کے القاب و خطابات اور مشہور اشتہارات گنائے تھے۔ حتیٰ کہ ایک جزو "گھسے پٹے جملوں" پر بھی لکھا تھا۔ آج سے پچاس برس پہلے، اسی انداز سے اردو کا ناک نقشہ کتنی آسانی سے بیان ہو سکتا تھا اور آج یہ کام کتنا مشکل ہے!

اردو ادیب کو یہی ایک مشکل درپیش نہیں۔ وہ دو زبانیں پڑھتا اور بولتا ہے اور جب یہ دو زبانیں اردو اور انگریزی کا سا وسیع اختلاف رکھتی ہوں تو یہ خوبی کتنی بڑی خرابی بن جاتی ہے۔ علمار اور ماہرینِ تعلیم، تاریخ اور تجربے کی مدد سے کئی ایک ناقابلِ تردید دلائل پیش کر کے ارشاد کریں گے کہ دو زبانوں کی مہارت بہت بڑی نعمت ہے بین الاقوامیت کے قائل یہ کہیں گے کہ ہر بیرونی زبان دوگونہ رحمت ہے اس ملک کے لئے جس کی وہ زبان ہے۔ اور اس کے لئے بھی جس نے اسے اختیار کیا۔ ان کا ارشاد بجا ہے کیونکہ ہر نئی زبان

ذہن میں ایک نیا دریچہ کھول دیتی ہے اور کون ہے جو روشنی کو پسند نہیں کرتا انسانوں کی اکثریت کے لیئے اس کے اثرات خوشگوار ہوں گے مگر افسوس کہ لکھنے والے کو اپنا دماغ ہی روشن نہیں کرنا کچھ کام بھی کرنا ہے۔ اظہار خیال اس کا فرض ہے اور اس پر طرّہ یہ کہ ایک وقت میں ایک ہی زبان کے ذریعے چاہے کتنی زبانوں سے اس نے ذہنی غذا حاصل کی ہو، ذہن تو اس کے پاس ایک ہی ہے۔ ایک دریچہ سبز ہے تو دوسرا سرخ مگر ذہن میں یہ دونوں رنگ آرام سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو اور ایک دوسرے سے جدا نہیں رہ سکتے۔ وہ آپس میں گھل مل کر ایک تیسرے رنگ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو ایک دریچے کے پاس ذرا زیادہ سبز ہے اور دوسرے کے پاس ذرا زیادہ سرخ مگر نہ کہیں پوری طرح سبز ہے اور نہ پوری طرح سرخ۔ یہ لطیف اور پُراسرار روشنی اس کے لیئے باعث نشاط بھی ہو سکتی ہے۔ اور باعث فخر بھی۔ مگر اس ملی جلی روشنی کو سبز یا سرخ فلٹر میں سے اپنے اصل رنگ میں گزارنا کتنا مشکل ہو گا۔ ایک لحاظ سے یہ کہنا درست ہے کہ دو زبانی ادیب اپنے دل کی بات آپ سے نہیں کہہ سکتا جب تک کہ دونوں زبانیں استعمال نہ کرے مگر اس صورت میں بھی ایک دقّت ہے۔ اس کا ذہن کسی واضح شکل میں ہمارے سامنے نہیں آتا بلکہ ذہن کی دو لہریں یکے بعد دیگرے پیہم ابھرتی ڈوبتی دکھائی دیتی ہیں۔ اگر اس کو ایک زبان کا پابند کر دیا جائے اور پوری بات کہنے کی مجبوری بھی ہو تو نیم واضح اور بے ربط و مہمل قسم کی گفتگو سننے میں آئے گی۔ اس کی تحریر کی بُنت میں آپ کو عجیب قسم کے خم و پیچ نظر آئیں گے۔ اور ابہام و اشکال کی کئی صورتیں ملیں گی اور سب سے بڑھ کر انگریزی ساخت کے جملے بے ڈھنگی اردو میں ملبوس دکھائی دیں گے جن کو دونوں زبانوں کے ماہرین ہی سمجھ سکیں گے۔ زبان ایک نازک اور لطیف آلۂ اظہار ہے جسے فنکار بڑی مہارت سے برتتا ہے مگر یہ دوغلی زبان معنی کے گرد طواف کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی اور گونگے کے اشاروں سے زیادہ قابل فہم نہیں ہوگی۔ لفظ اپنے معنوں کو ساتھ لے کے

نہیں چلتے بلکہ محض دُور سے ان کی طرف اشارہ کر کے رہ جاتے ہیں۔ جب احساسِ شکست قوی ہو جاتا ہے تو اردو کا ادیب اردو کو چھوڑ کے انگریزی میں لکھنے لگ جاتا ہے مگر فلٹر سبز ہو یا سرخ، مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہمارا ادیب اپنے آپ کو ایک نئے معاشرے میں گھرا ہوا دیکھتا ہے یہ معاشرہ اس کے فہم و بصیرت کی حد و سے بڑھ کر وسیع اور پیچیدہ ہوتا چلا جاتا ہے ایسا معاشرہ اس کے اسلاف کے تجربے اور مشاہدے سے ماورا ہے۔ اور اسی وسیع و عریض حقیقت سے اس کو موافقت پیدا کرنا ہے تاکہ تکمیل اور استحکام حاصل ہو جب تک یہ موافقت پوری نہیں ہوتی وہ بڑے پرجوش اضطراب کے ساتھ کسی نہ کسی طرز کی محفل بنا کے بیٹھ جائے۔ اسی اضطراب کی وجہ سے اس زمانے کے اکثر ادیب ایک نہ ایک انجمن یا حلقے سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی تصانیف پر دیباچے اور پیش لفظ لکھتے رہتے ہیں۔ آج سے پہلے شاید ہی کبھی ہمارے ادیبوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے، محفلیں، انجمنیں اور حلقے بنانے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ یہ ادارے کتنی ہی سنجیدگی اور خلوص سے کیوں نہ وجود میں آئے ہوں، معاشرہ سازی کی جبلی مجنونانہ کوششوں کا نتیجہ ہیں اور ادیب کو ان آوارگیوں اور سیاحوں کی قیمت اپنے تخلیقی جوہر سے ادا کرنی پڑتی ہے۔ ان غیر واضح قسم کی حرکتوں سے اس کا مدعا یہ ہے کہ زندگی کے "کمی" کو پاٹے اور چونکہ بیرونِ خانہ سے اس کا رابطہ قائم نہیں ہوا۔ اس کو درون خانہ میں تلاش و تجسس سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر اس تلاش کے دوران میں زندگی کا کاروبار ملتوی ہوتا رہتا ہے۔ اور جب تک کوئی زرخیز زمین ملے زندگی کا رس خشک ہو جاتا ہے۔

پی ای این کی سترھویں سالانہ مجلس میں تقریر کرتے ہوئے آرتھر کیسٹلر نے بتایا تھا کہ تورگنیف کیسے لکھتا تھا۔ اپنے پیروں کو گرم پانی کی بالٹی میں ڈالے ہوئے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا تھا۔ یہ گرم پانی کی بالٹی کیسٹلر کے نزدیک الہام یا تخلیقی سرچشمے

سے عبادت تھی اور کھڑکی سے مراد باہر کی دنیا تھی جو فن کار کے لئے خام مواد کا کام دیتی ہے۔ کیسٹلر نے یہ بھی کہا تھا کہ باہر کی دنیا۔ ادیب کے دل میں ایک زبردست خواہش کو جنم دیتی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ کھڑکی بند کر کے بیٹھ جائے اور اپنے تخلیقی سرچشمے پر اکتفا کرلے مگر اس کے علاوہ بھی ایک خواہش پیدا ہوسکتی ہے۔ باہر کی ہوا دباؤ ڈالنے کی بجائے اس کو باہر بھی کھینچ سکتی ہے۔ تاکہ وہ گرم پانی سے اپنے پیر نکال کر کھڑکی پر جھک جائے۔

ہمارے اردو ادیب کو بازار کے واقعات سمجھنے میں مشاہدہ اور مرکزیت پیدا کرنے کی ضرورت کچھ اس شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اس کو اکثر و بیشتر کھڑکی پر جھکا دیکھ کر ہمیں حیرانی نہیں ہونی چاہیئے۔ باہر منظر اس کے لئے اتنا دلفریب ہوتا ہے کہ وہ چیخنے چلانے سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔ وہ لکھنے کی میز پر واپس نہیں آتا اور گرم پانی پڑا پڑا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے ایک نئی دنیا ابھر آئی ہے۔ دیکھنے اور سمجھنے کے لئے بے شمار چیزیں ہیں اور چھانٹنے کے لئے بے پناہ مسالہ ہے۔ اس حالت میں اس سے عظیم فن پاروں کی توقع بے جا ہے اور یہ امید بھی عبث ہے کہ وہ اپنے پیر کو گرم پانی میں ڈالے رکھے گا۔ اور کلیوں بازاروں کے ہجوم میں شامل نہیں ہوگا۔ آنیوالے فنکار ساتھیوں کو اس کے یہاں مقصد کی سنجیدگی ملے گی اور آگے بڑھ کر دیکھنے اور مستقبل کو تلاش کرنے کی ہمت چاہیئے۔ اسلاف کی دعائیں اس کے ساتھ ہوں یا نہ ہوں۔ اس کی تیز نظری اضطراب، آگاہی اور بے جگری، نئی راہوں پر چلنے کا عزم اور کچھ کھونے پانے سے اس کی بے نیازی یادگار رہے گی۔ ہم اس سے بڑا خراج تحسین اس کو نہیں دے سکتے کہ اس کی مشکلات اور مجبوریوں، تکلیفوں اور تعزیروں کو سمجھیں تاکہ اس کی جدوجہد اور اس کے کارنامے کی بیش از بیش قدر کر سکیں۔ میں نے اسی جگہ یہی کہنے کی کوشش کی ہے

نیاز مندانِ لاہور کا سلسلہ

یوپی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں

نیاز مندان لاہور

جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانند پیاز ہیں۔ تو بر تو اور لباس در لباس وہم در وہم قیاس در قیاس۔ پیاز کے چھلکے جس قدر اتارتے جاؤ گے چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا۔ مغز نہ پاؤ گے۔ (غالبؔ)

"کارواں" کا یہ دوسرا نمبر دنیا کے سامنے ہے۔ یہ رسالہ پنجاب کے چند نوجوانوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ جنہوں نے پچھلے سال جناب چغتائی اور جناب تاثیر کے زیر قیادت اور اس سال جناب چغتائی اور جناب مجید ملک صاحب کے زیر ہدایت اس بات کی کوشش کی ہے کہ حسب استطاعت ان فنون لطیفہ کے ذریعہ جن کا ظہور سطح قرطاس پر ممکن یا سہل ہے۔ ہندوستان کے موجودہ اہل فن کے مزاج سے تعلیم یافتہ حضرات کو روشناس کرایا جائے اس میں کسی صوبے کی قید نہیں۔ اور فہرست مضامین سے ظاہر ہوگا۔ کہ اس مبارک دریوزہ گری کے لئے ہندوستان کے سب صوبوں کے سامنے ہاتھ پھیلایا گیا ہے۔ اگر آپ کو اپنے بعض دل پسند نام اس فہرست میں نظر نہ آئیں تو اس کو سائل کے استغنا پر نہیں، اس کی نامرادی پر محمول کیجئے۔

ادب و انشا کے نمونے پیش کرنے کے لئے زبان اردو کو منتخب کیا گیا ہے نہ اس لئے کہ اور کوئی زبان در خور اعتنا نہیں نہ اس لئے کہ پنجاب میں صرف یہی ایک زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ اس لئے کہ پنجاب کے نوجوانوں کا وہ طبقہ جسے کارواں سے وابستگی کا فخر حاصل ہے اپنی تعلیم اپنی تہذیب، اپنی تربیت اور اپنے جذبات عقیدت و الفت کی وجہ سے اردو ہی کو اپنے لئے

بہترین ذریعہ اظہار سمجھتا ہے۔ مبصرین سے پوشیدہ نہیں کہ اس وقت ہندوستان میں اردو کے تین مرکز ہیں۔ یو پی۔ حیدر آباد (دکن) اور لاہور لیکن اہل بنیش بھی یہ بات اکثر بھول جاتے ہیں کہ یو پی میں یہ زبان خودرو ہے۔ حیدر آباد میں یہ زبان ایک والیِ ملک کے سایۂ عاطفت میں پل رہی ہے اور صرف پنجاب ہی ایک علاقہ ہے جہاں اس کی نشوونما محض خونِ عشاق کی مرہونِ منت ہے۔ جس جگہ یہ زبان خودرو ہے وہاں خودبین بھی ہے جہاں اتالیق شاہی سے تعلیم پا رہی ہے وہاں عوام سے کچھ بچ کے رہتی ہے لیکن پنجاب میں اس زبان کی حالت ایک ہونہار تنومند نوجوان کی ہے جس کا خون گرم ہے اور جس کے اعضا میں لچک ہے جو چھلانگیں مارتا جاتا ہے۔ اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ اس کا ہر قدم پگڈنڈی پر پڑتا ہے۔ یا نہیں۔ اسے سمت کا اتنا ہی شعور ہے جتنا کسی اور قدرتی نمو کو ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ سوائے گرمیِ حیات کے اور کسی بیرونی قوت کا احساس نہیں۔ لیکن قوت نامیہ خود ہی رستہ ڈھونڈتی ہے۔ جو بخطِ مستقیم کھلی روشنی اور تازہ ہوا کی طرف جاتا ہے

یہ کہنا کہ پنجاب نے یو پی سے کسب فیض نہیں کیا یا یہ کہ پنجاب یو پی کی روایات سے یک قلم مقاطعہ کرنے پر تلا ہوا ہے کذب اور مبالغہ نہ ہوگا یو پی کے قدیم اساتذہ میں سے کونسا ایسا ہوگا جسے پنجاب نے ایک بار، سو بار، ہزار بار نہیں پڑھا، وہ کونسا ایسا دیوان ہے جس کی ورق گردانی نہیں کی وہ کونسا ایسا شاہکار ہے جسے حرزِ جاں بنا کر نہیں رکھا لیکن یو پی کے چشمے خشک ہو چکے۔ پیاس بجھانے کے لئے اب وہاں جانا بے سود ہے۔ اب پنجاب کی رہبری بجز اس کی اپنی قوت نامیہ کے کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ یو پی میں ادب اردو کا سسکتا ہوا سانپ ہے جو کبھی کبھی ایک نحیف سی پھنکار مارتا ہے اور بس۔ اب یو پی صرف اعتراض کر سکتا ہے رہنمائی نہیں کر سکتا اور نہیں جانتا کہ اس کا چڑچڑا پن، اس کا مربیانہ انداز، اس کی طفلانہ تنقید یہ سب انحطاط کی نشانیاں ہیں ہم جانتے ہیں کہ یوں ایک خودبین ہستی کو اس کے انحطاط کی خبر سنانا بے رحمی ہے لیکن یہ بے رحمی ایک نشتر زن کی بے رحمی ہے اس میں معمول کی دلداری کا خیال کرنا فضول ہے۔

اس انحطاط کے ثبوت میں کوئی سی ایسی تنقید اٹھا کے دیکھ لیجئے جو کسی یوپی کے مرتب کئے ہوئے رسالے میں چھپی ہو۔ اگر وہ تنقید ڈرامے پر ہے تو ڈرامے کے اصولوں سے کچھ بحث نہیں مناظر کی ترتیب سے کچھ واسطہ نہیں، اسٹیج کی موزونیت سے کچھ تعلق نہیں۔ اگر نظم پر ہے تو شاعر کی نفسیات درخورِ اعتنا نہیں۔ اس کی جدت زیرِ غور نہیں۔ اس کی ذہنی کشمکش پر نظر نہیں۔ اگر افسانہ ہے تو توازن کا ذکر نہیں، فضا کا احساس نہیں۔ مطلب کا شعور نہیں اگر ترجمہ ہے تو فقروں کی ترتیب پر توجہ نہیں۔ اصل سے مقابلہ کا حوصلہ نہیں۔ اجتہاد کو پرکھنے کی استعداد نہیں حرف زبان کے اعتراضات پر زور ہے۔ اِس محاورے پر، اُس لفظ پر، اس حرف پر، اس نقطے پر نظریں گڑی ہوئی ہیں۔ نگاہ میں یہ وسعت نہیں اور طبیعت میں یہ بلندی نہیں کہ کسی اور چیز کو جانچ سکیں۔ یا اصل مدعا کے متعلق چھوٹے منہ سے دو لفظ بھی کہنے کی توفیق پیدا کر سکیں زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کاروانِ اردو کئی منزل طے کر گیا لیکن حضرات یوپی ہنوز "تک" اور "تلک" کے پھیر میں ہیں۔ وہ زبانِ اردو کو اشوک کا ایک کتبہ سمجھتے ہیں جو دہلی یا لکھنؤ میں نصب ہے اور جس کا تتبع ان پر بھی ضروری ہے جو جمادات کی منزل سے آگے نکل چکے ہوں۔

گذشتہ سال کے کاروان پر کئی رسائل نے زبان کے اعتراض کئے تھے۔ لیکن ہم لوگ اس قسم کے اعتراضات سننے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم یوپی کے حضرات کو اس شغلے سے محروم نہیں کرنا چاہتے۔ اس انحطاط کے زمانے میں اب یوپی کے پاس یہی ایک کھلونا رہ گیا ہے۔ گو بڑھاپے پن کا یہ عالم ہے کہ خود اس سے کھیل نہیں سکتے اور کسی کو کھیلنے نہیں دیتے۔ بے ہنر نقادوں کا ہنر اب یہی رہ گیا ہے کہ جہاں پنجاب کا کوئی مضمون چھپے اس کے ہر جھوٹے سے جھوٹے فقرے کو ہر بڑی سے بڑی فرہنگ کے ساتھ پرکھیں اہلِ قلم کی ہر قوت کو محض "تذکیر و تانیث" کے معیار سے ناپیں اور اس کے بعد ایک "فہرستِ اغلاط" مرتب کر کے فنِ تنقید کی گور پر لات ماریں مطالب یا فن یا حسنِ بیان کی طرف ڈر کے مارے صرف کنکھیوں سے دیکھ لیں۔ اور اگر باوجود اپنی نااہلی کے مرعوب ہوئے بغیر چارہ نہ ہو تو اپنی بے چارگی کو "اچھا ہے" یا "خوب ہے" جیسے

بے معنی فقروں سے ڈھانپ کر اپنی کم مائگی کو فہرست اغلاط کی طوالت سے پورا کرنے کی کوشش کریں۔ یا اگر کسی ریلوے بک سٹال سے کسی انگریز لال بجھکڑ کی کوئی ارزاں کتاب مبادیات انشاء کے متعلق دستیاب ہو جائے تو اس کے فرسودہ خیالات کے پھوسڑوں سے اپنی تھوڑی بہت ستر پوشی کر کے یہ سمجھ بیٹھیں کہ اب ہم علم و فن کی تمام آرائشوں سے مزین ہیں۔ اور کیا مشرق اور کیا مغرب دنیا بھر کا ادب ہمارے ہی گوشہ چشم سے کیمیا بننے کو ہماری دہلیز پر پڑا ہوا ہے۔

اگر یوپی کے سب رسالے اسی جہل سے مرکب ہوتے تو اس مضمون کا لکھنا محض بے سود تھا لیکن ان میں سے چند رسالے ایسے بھی ہیں جن کی ہر اشاعت کے ساتھ نہایت خوش گوار توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ اور جنہیں پنجاب کا ہر وہ ادب آشنا جسے اہل نظر کی تلاش رہتی ہے بہت شوق سے پڑھتا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ایسے رسالوں کے مرتب کرنے والے بھی باوجود اپنے علم، اپنے ذوق اور اپنی متانت طبع کے یوپی کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمارا روئے سخن اس وقت ان کی طرف ہے اور ان میں سے دو رسالے خاص طور پر ایسے ہیں جن سے مخاطب ہونا خود ہمارے لئے فخر کا باعث ہے۔ ہماری مراد "علی گڑھ میگزین" اور "جامعہ" سے ہے۔

علی گڑھ کا خطہ مردم خیز خطہ ہے اور اس کی زمین کا ہر ذرہ قابل احترام ہے۔ ہندوستان میں جہاں بھی کوئی ایسا شخص ہے جو تہذیب جدید کے ساتھ ٹکرانے میں پریشان نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اردو زبان کو اپنے لئے روح پرور تصور کرتا ہے وہ علی گڑھ کے نام کو اسم اعظم اور علی گڑھ کی مطبوعات کو ترقی کا پرچم سمجھتا ہے لیکن علی گڑھ میگزین بھی جب کارواں پر تنقید لکھنے بیٹھا تو اس نے اس تنقید کا تقریباً نصف حصہ زبان کی لغزشوں کی نذر کر دیا۔ افسانوں پر پانچ سطروں کا ایک پیراگراف لکھا اور وہ بھی ایسا جس میں علم کم اور متانت پوش بچپن زیادہ پایا جاتا ہے تصاویر کے متعلق صرف اتنا لکھ دیا کہ سب کی سب دلکش اور دلآویز ہیں۔ یہ الفاظ نہایت محفوظ ہیں۔ لیکن نہ اس قدر کہ ان کے شگافوں میں سے تنقید نگار کا کورا پن نظر نہ آئے۔ البتہ یہ بڑے وثوق سے کہہ دیا کہ "معراج" مونث ہے مذکر نہیں۔ اس کا جواب در اصل تو یہ ہے کہ بہت اچھا

صاحب! معراج مونث ہی سہی لیکن اس کی وجہ سے آپ کو صرف اتنی ہی زحمت اٹھانی پڑے گی کہ جہاں "معراج تھا" لکھا ہے وہاں پنسل سے "تھا" کی بجائے "تھی" کر لیجئے قصہ ختم ہو گیا ہے اس کے بعد مضمون کو پڑھئے۔ اگر لطف آئے تو کہئے اچھا ہے ورنہ اس پر خاک ڈالئے۔ معتیازانداز اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بقول آپ کے ہم "اس قسم کے اعتراضات سے آزردہ ہوتے ہیں" ہمیں آزردہ کرنے سے کیا حاصل؟ اس غلطی کو اگر آپ نظر انداز کر دیتے تو نہ صرف آپکی تنقید کا معیار ہی بلند رہتا بلکہ ہماری دلی عقیدت بھی متزلزل نہ ہونے پاتی۔ ناسخ نے کیا خوب کہا ہے ۔ ؎

کسی دل تک رسائی ہو سکے تو عرش ہے یہ بھی
عزیزہ گر نہیں معراج ممکن عرشِ اعظم کا

شعر معمولی ہے لیکن جذبہ نہایت صحیح ہے اور عجب نہیں کہ آپ اس سے متاثر ہوں "

محولہ بالا تنقید خود ایڈیٹر صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ تازہ ترین اشاعت میں انہوں نے "آغاز داستان" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے۔ اس کے تقریباً ہر صفحے پر اس سے بد تر لغزشیں موجود ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"سالنامہ کی خصوصیات اس کی دلچسپیاں اور دلفریبیاں ہم سے نہ کہلوائیے۔"

(عطف کا یہ غلط استعمال خاص علی گڑھ میگزین کا حصہ ہے اور "خصوصیات کہلوانا" تو ایسا محاورہ ہے کہ کیا کہنے)

"چھوٹے ہوؤں سے ملنا" پنجاب اس مطلب کو یوں ادا کرتا تو آپ ہی مربیانہ تبسم سے فرماتے کہ یہاں "بچھڑے ہوؤں" چاہیئے۔

"سب سے زیادہ موجب مسرت خبر کابل یونیورسٹی کا قیام ہے" (جناب اہلِ زبان صاحب! کابل یونیورسٹی ابھی قائم نہیں ہوئی۔ جب قائم ہو جائے گی تو جو آپ کا دل چاہے لکھ لیجئے گا۔ فی الحال تو جس خبر سے آپ کو مسرت ہوئی ہے وہ قیام کی تجویز ہے)

پہلے سے جو مضامین کی آخری تاریخ مقرر کی جاتی ہے . . ." (مضمون کی تاریخ نہیں ہوتی۔

مضمون بھیجنے یا پہنچنے کی تاریخ ہوتی ہے)

تمام ضروری خبریں اور اہم اجتماعوں کے متعلق پچھلے نمبروں میں لکھا جا چکا ہے" (اس ایک فقرے میں صرف و نحو اور بیان کی اتنی غلطیاں ہیں کہ ان میں سے دو ایک تو خود ہی آپ کو سوجھنی چاہئیں).

معلوم ہوتا ہے آپ ہماری اصلاح میں اس قدر وقت ضائع کر دیتے ہیں کہ خود کچھ سیکھنے سکھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن پنجاب کا ایک رسالہ بھی ایسا نہیں جو آپ پر نکتہ چینی کرنے کو اپنے لئے باعث فخر و ناز سمجھے۔ ہم مہینے کے مہینے خود یوپی کے رسالوں میں سے زبان صرف و نحو اور انشا کی غلطیوں کی ایک طویل فہرست اہل بصیرت کی عبرت کیلئے مرتب کر سکتے ہیں. لیکن ہم نے اب تک یہ پیشہ اختیار نہیں کیا اور سچ پوچھئے تو ہمیں اس کی فرصت بھی نہیں۔ یہ شغلہ آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہم آپ کی خوبیوں پر نظر رکھتے ہیں کیونکہ ہم نوشت و خواند کو وجہ مسرت اور ذریعہ اتحاد سمجھتے ہیں۔ آپ ہمارے نقائص کریدتے رہتے ہیں. آپ نے زبان کو اپنے لئے مرد تسمہ پا بنا لیا ہے جو نحیف ہے مگر جس نے آپ کا ٹینٹوا دبا رکھا ہے.

"جامعہ" کی حالت اس سے بھی زیادہ قابل افسوس ہے کیونکہ "جامعہ" کے حلقے میں بعض ایسی شاندار ہستیاں بھی شامل ہیں جن کی توجہ کو جذب کرنا بھی باعث سعادت ہے ان کا جوش عمل اور ان کا تبحر علمی ہم ہیچ میرزوں کی تعریف و توصیف سے بالا تر ہے۔ پھر کیا یہ حیرت کا مقام نہیں کہ یہ زبان کا جنون ان کی سلامت طبع کو بھی ملوث کر رہا ہے۔ اور وہ بھی تنقیص کے نشے سے بے خود ہو کر تفکر و تعمق سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اس زبان درازی کا حوصلہ ہمیں صرف اس لئے ہوا کہ "جامعہ" نے فہرست اغلاط میں "منزل گاہ" جیسے لفظ کو بھی شامل کر لیا۔ اور کہہ دیا کہ یہ ترکیب صحیح نہیں۔ غالباً قافیہ کی مجبوری تھی۔ یہی وہ ادعا اور تیقّن ہے۔ جس کی ایک موٹی سی تہ یوپی کے اکثر دماغوں پر جمی ہوئی ہے۔ اے کاش کہ فاضل تنقید نگار

صاحب اپنے لہجے میں تھوڑا سا منکسرانہ مگر مخلصانہ تامل پیدا کر لیتے۔ اے کاش اب بھی کبھی کبھار اپنا انداز طالب علمانہ بنا لیا کریں اور خشوع و خضوع کے ساتھ یہ شعر گایا کریں ؎

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

لیکن اسے پڑھ کر بھی وہ شاید یہی کہیں گے کہ "ترکیب صحیح نہیں۔ غالباً قافیہ کی مجبوری تھی"

جامعہ کے جس نمبر میں کارواں پر تنقید چھپی ہے اسی نمبر میں زبان کی کئی دلچسپ غلطیاں موجود ہیں جنہیں ہم یہاں نقل کرنا سوءِ ادب سمجھتے ہیں لیکن اربابِ جامعہ کا اشارہ پاتے ہی ہم ان کی خدمت میں پیش کرنے کو تیار ہیں۔

جامعہ کی تنقید کا انداز ضرورت سے زیادہ پیغمبرانہ ہے اور "عمل پیہم" اور "قومی سیرت" اور "اصلاح" مدِ نظر ہے اور "ہمیں خوشی ہے" اور "ہمیں امید ہے" اور اسی قسم کی آیات سے فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ پر عمل کرنے کی کوشش بہت نمایاں ہے لیکن چونکہ یہ انداز جامعہ کا مستقل انداز ہے اور اس کے اغراض و مقاصد میں شامل ہے اس لئے ہمیں اس پر اعتراض کرنے کا حق غالباً حاصل نہیں تاہم اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ نقد و نظر کے اعتبار سے اس تنقید کا "وزنِ مخصوص" بہت کم ہے اور پڑھنے والے کو اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا بجز اس احساس کے کہ تنقید نگار اپنے سینے میں دلِ دردمند رکھتے ہیں۔ اور یہ احساس لاریب دونوں جہان میں امتِ مرحوم کے لئے بھلائی کا موجب ہوگا۔

"پنجابی محاورے" خاص طور پر قابلِ بحث ہیں۔ "علی گڑھ میگزین" اور جامعہ دونوں نے ان کا ذکر کیا ہے۔ اور کنایتہً بالکل بجا فرمایا ہے کہ یہ محاورے ٹھیٹھ پنجاب کی پیداوار ہیں یہاں تک تو ہمیں ان سے پورا اتفاق ہے مثلاً پنجاب کے لوگ "مجھے جانا ہے" کی بجائے "میں نے جانا ہے" اور "میری سمجھ میں نہ آتا تھا" کی بجائے "مجھے سمجھ میں نہ آتا تھا" بولتے ہیں۔ لیکن

یہ دونوں رسالے اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جب پنجاب نے اردو کو اپنا لیا ہے تو اس قسم کے تصرفات لابدہیں اور جوں جوں پنجاب میں اردو ترقی کرے گی، ایسے تصرفات کی تعداد بجائے کم ہونے کے اور بڑھے گی، اس کے ثبوت اور جواز دونوں کے لئے کسی زبان کی تاریخ ارتقا کا مطالعہ کیجیے اس کے بعد اگر آپ ذرا بلند نظری سے کام لیں۔ تو آپ پر روشن ہو جائیگا کہ اگر اردو کو پنجاب میں نشو و نما نصیب ہونی ہے تو ان تصرفات کے بغیر چارہ نہیں۔ بلکہ ان ہی کی بدولت پنجاب میں اردو کی جڑیں مضبوط ہوں گی اور وہ ایک کتابی زبان کے درجے سے ایک فطری زبان کے رتبے تک جا پہنچے گی۔ وہ وقت آن پہنچا ہے جب کہ آپ اردو لغت کی کتابوں میں لکھنؤ اور دہلی کے محاوروں کے پہلو بہ پہلو پنجاب کے محاورے بھی شامل کریں۔ چہ جائیکہ آپ ان کو اغلاط قرار دیں۔ پنجاب کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تو اب یہ حالت ہو چلی ہے کہ جہاں کوئی محاورہ باز "سمجھے جاتا ہے" کہتا ہے پڑھے لکھے لوگ اسے ملامت کرتے ہیں کہ یہ کیا چپڑ قناتیوں کی زبان بول رہے ہو؟ اپنا "پنجابی ڈھنگوں" کی طرح باتیں کرو۔ ریختی مت بولو۔ کارواں کی اس اشاعت میں جناب تاثیر کی نظم کا پہلا مصرعہ ہے ؎

تونے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لئے

ان سے کہا گیا کہ "تونے . . . . . . کرنی ہے" کی بجائے "تجھ کو الفت مجھ سے کرنی ہے" رکھ دیجیے۔ انہوں نے فرمایا "ہرگز نہیں! 'تونے الفت مجھ سے کرنی ہے' میں ترنم زیادہ ہے میں مصدر کے ساتھ "نے" استعمال کرتا بھی ہوں اور نہیں بھی کرتا۔ مصرعے یا جملے کے ترنم کیمطابق جہاں پنجابی محاورہ مجھے مفید مطلب نظر آتا ہے۔ وہاں میں بحیثیت پنجابی اردو خوان کے اسے استعمال کرنا اپنا حق سمجھتا ہوں۔ یوپی کے حضرات اس حق سے محروم ہیں۔ وہ مجبور ہوں تو ہوں میں مجبور نہیں"

علی گڑھ میگزین اور جامعہ دونوں بہترین ہندوستانی تہذیب کے علمبردار اور آئینہ

دار ہیں. جس فضا میں یہ رسالے ترتیب پاتے ہیں. وہ ہندوستان کی بہترین علمی فضا ہے اور ان کے مدیر و معاون حضرات اہل پنجاب کے نزدیک بوجوہ محبوب و مقتدر ہیں ہم میں سے اکثر ایسے ہیں جن کو ان حضرات سے ذاتی تعارف کا فخر حاصل ہے اور خدا گواہ ہے کہ ان کا حسن اخلاق اور ان کی بالغ نظری ہمارے نزدیک مسلّم اور ان کی صحبت کی یاد (ہر چند کہ وہ صحبت بہت مختصر تھی) بالیدگیٔ رُوح کا موجب ہے. لیکن جہاں ہماری عقیدت کا یہ عالم ہے وہاں توقعات بھی کچھ کم نہیں. ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ دو رسالے ہندوستان بھر میں تنقید کی رہنمائی کریں گے. ادب و انشا کے مقابلے میں ایسے معیار قائم کریں گے جو کم از کم نصف صدی تک اہلِ قلم کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دیں. صوبجاتی اور بلدیاتی حدود سے باہر قدم رکھ کر کل ہندوستان میں اردو کے مستقبل پر غور کریں گے اور اپنے رویے سے ایسے ایسے اصولوں کی نگہبانی کریں گے. جن کی تائید ہمیشہ فرہنگِ آصفیہ سے نہ ہوسکے گی. بلکہ جن کی بدولت خود فرہنگ آصفیہ رفتہ رفتہ بے کار ہو کر رہ جائے گی تاکہ دنیا پر یہ ثابت ہو جائے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے جو بڑھ رہی اور پھول رہی ہے

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں. پنجاب اس زبان کو اپنے خون سے سینچنے کو تیار ہے اس لئے ظلم ہے اگر اس سے بار بار یہی کہا جائے کہ تمہارا خون رذیل ہے. اور اس کے مقابلے میں بار بار ان مردہ ہڈیوں کو سراہا جائے جو مدت ہوئی بے مغز ہو چکیں ہم آپ سے رہنمائی کی توقع رکھتے ہیں. رہزنی کو آپ کی شایانِ شان نہیں سمجھتے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ہم نیازمندوں کو شرفِ باریابی بخش کر ہماری عقیدت اور اپنی دریادلی سے بزم اردو کی زینت کو بڑھائیں گے. نہ یہ کہ قلعہ معلےٰ کے کھنڈروں پر نت نئے تالے ڈالتے چلے جائیں گے.

"بقلم پطرس"

خطوط

بنام عبدالمجید سالک

نیویارک ۱۶ ستمبر ۱۹۵۱ء

برادرِ محترم سلام مسنون۔ امید ہے آپ مع الخیر لاہور پہنچ گئے ہوں گے۔ انقلاب کے معطل ہو جانے کے بعد آپ اغلباً مسلم ٹاؤن ہی میں خانہ نشین ہوں گے۔ تاہم جب کبھی شہر جانا ہو اور دوستوں سے ملاقات ہو تو انہیں میرا سلام کہیئے گا۔ چند دن ہوئے میں نے امتیاز کو خط لکھا تھا۔ جواب سے حسب معمول محروم ہوں اور شاید محروم رہوں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم میری محرومی ہی کا احساس ان تک پہنچا دیجئے کہ عشق کے کاروبار میں اس سے بھی بسا اوقات فائدہ پہونچتا ہے۔ کیا صوفی صاحب بدستور نیو ہاسٹل میں حکمران ہیں یا کچہری روڈ کی سرکاری کوٹھیوں میں سے کسی کوٹھی میں پہنچ گئے ہیں۔ نہ معلوم پرنسپل کون ہیں۔ آخری اطلاع ڈاکٹر صادق کے متعلق تھی اور کیا شریف صاحب کراچی میں ہیں یا لاہور واپس آگئے ہیں؟ ان سوالات سے محکمانہ معاملات کو کریدنا مطلوب نہیں۔ محض احباب کے منتشر ماحول کا نقشہ ذہن میں جمانا چاہتا ہوں اسی طرح کے سوالات ہاشمی صاحب اور عابد علی صاحب کے متعلق بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ عابد صاحب نے زندگی میں چند در چند ڈرامے پیدا کر لئے ہیں۔ میں ابتدائی مناظر سے بھی بے خبر ہوں اس لئے سکیم کا خاکہ تک سمجھ میں نہ آیا۔ خلیفہ حکیم کے متعلق آخری اطلاع تھی کہ وہ اقبال اکیڈمی کے ڈائرکیٹر ہیں۔ کیا یہ اکیڈیمی پنپ رہی ہے اور لاہور میں ہے؟ میں نے خلیفہ صاحب سے "اسلامی کلچر" پر یہاں کی ایک متعدد مؤلف کے لئے ایک مضمون لکھوایا تھا وہ عنقریب اور فلسفیانِ عالم کے رشحاتِ قلم کی معیت میں کتابی شکل میں شائع ہوگا اور یہ پہلا موقع ہوگا کہ اسلام پر کسی پاکستانی کا مدلل مضمون اس ملک میں عزت و آبرو کے ساتھ چھپے۔ یہاں کی ایک یونیورسٹی میں مذاہب قدیم اور حقوق انسانی کے مضمون پر دسمبر میں ایک مناظرہ ہوگا اس سلسلے میں بھی میں نے خلیفہ حکیم صاحب کے لئے بے حد سعی کی کہ اسلام کی نمائندگی وہ کریں

آخر اس میں کامیاب ہوا۔ خلیفہ صاحب کا کرایہ وغیرہ یونیورسٹی دے گی کینیڈا کی MCGILL یونیورسٹی وظیفے دے کر اسلامیات کے طلباء اور فارغ التحصیل بزرگوں کو سال دو سال کے لئے یہاں بلانا چاہتی ہے عنقریب وہاں کے پروفیسر سمتھ انتخاب اشخاص کے لئے پاکستان کا دورہ کریں گے میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ آپ سے بھی ضرور ملیں سمتھ پہلے بھی ہمارے ملک کی سیاحت کر چکے ہیں MODERN ISLAM IN INDIA کے مصنف ہیں۔ آغا حمید وغیرہ انہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ چوہدری ظفر اللہ خان صاحب آج کل یہاں ہیں مباحثۂ کشمیر کے آنے والے سین کے لئے سٹیج تیار کر رہے ہیں اور بے انتہا تگ و دو میں معروف ہیں خدا کرے ہم اس قضیئے سے عزت کے ساتھ اور بوجہ احسن عہدہ برآ ہوں۔ ایک اور یونیورسٹی خشک علاقوں میں آبپاشی پر ریسرچ کرنا چاہتی ہے۔ لیکن کسی ایشیائی یونیورسٹی کے ساتھ مل کر۔ بیروت اور پنجاب دونوں زیر غور ہیں۔ میں پنجاب کے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ اغلباً کام بن جائے گا۔ بس اپنی حکومت اور پنجاب یونیورسٹی کے اشارے کا منتظر ہوں کہ وہ یہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں یا نہیں۔ ڈاکٹر ٹرائس (سابق پرنسپل فارمن کالج) بیچ مُمِد ہیں اور خوب زور لگا رہے ہیں

آپ کے لاہور میں پھر براجمان ہونے کا خیال آتا ہے تو کئی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں تاہم جب تک آپ کراچی میں تھے آپ کی موجودگی سے زبیدہ اور ان کے تعلق سے مجھے ایک اطمینان تھا۔ سب لوگ کراچی کی سمت ہجرت کر رہے ہیں۔ لاہور کا (بقول ملاپ پرتاپ) "اب کیا بنے گا؟"

مہر صاحب کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اغلباً اب بھی اپنی چھڑی ہاتھ میں لے کر علی الصبح سانپ مارنے کے لئے جنگل میں گشت لگاتے ہوں گے۔ انہیں بھی میرا سلام کہئے گا۔

آج اتوار کا دن ہے۔ ردّی چھانٹ رہا ہوں۔ یہ مشغلہ ہر ملک اور ہر زمانے میں سوہانِ روح ہوتا چلا آیا ہے۔ اگلے ہفتے سے پیرس کے سفر کے لئے ٹیکے لگوانا شروع کر دوں گا پہلے ٹیکے سب زائد المیعاد ہو چکے ہیں۔ کل شام ٹیلی وژن پر میرا انٹرویو نشر ہوگا۔ کچھ کشمیر کچھ جاپانی عہد نامہ کچھ کوریا۔ وقس علیٰ ہٰذا۔ غرض صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ الخ

خاکسار

بخاری

بنام عبدالرحمٰن چغتائی

۳۰ تغلق روڈ ۔ نئی دہلی

۱۱ ر اکتوبر

شفقی و مکرمی جناب چغتائی صاحب ۔ سلام مسنون ۔ افسوس کہ لاہور میں آپ کی ملاقات سے
محروم رہا ۔ معلوم ہوا آپ شکار کو تشریف لے گئے تھے ۔
واپسی پر ایک خط ملا جو بعینہٖ ارسال خدمت ہے ۔ خط کے دو حصے ہیں ایک آپ کے نام
ایک میرے نام ۔ دونوں بھیج رہا ہوں ۔ مطلب آپ پر خود ہی ان کے پڑھنے سے ظاہر ہو جائے گا ۔ مجھے
صرف اتنا کہنا ہے کہ لکھنے والے یعنی EVELY WOOD صاحب آج کل والٹر تھامپسن کمپنی میں ملازم
ہیں جو ADVERTISING کمپنی ہے اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے اپنی پبلسٹی کو ہر وقت دلکش بنانے کے
درپے رہتی ہے ۔ WOOD صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں ۔ لٹریچر اور مصوری دونوں کے مشہور
طالب علم اور نقاد ہیں ۔ اور آپ کے معترف اور مداح معلوم ہوتے ہیں ۔ آج کل کلکتے میں ہیں ۔ لیکن
اس سے پہلے سالہا سال بمبئی میں تھے ۔ یہی ان کا روزگار تھا ۔ علاوہ برآں بمبئی کے اہل فن میں نمایاں
حیثیت رکھتے تھے اور اکثر تصویروں کی نمائشوں میں کرتا دھرتا ۔ مسز وادیا اور اس قسم کے لوگوں کے
ساتھ شریک رہتے تھے ۔ جو جواب آپ ان کو بھیجنا چاہیں وہ خواہ براہ راست ان کو بھیج دیں خواہ
میری معرفت ۔

بندۂ خاکسار

بخاری

سید امتیاز علی تاج کے نام

ڈیئر امتیاز۔ دسمبر کے آخر میں دو مہینے کی رخصت لوں گا۔ جو بیشتر دہلی میں اور باقی کسی پہاڑی مقام پر گزاروں گا۔ یکم مارچ کو پرنسپل گورنمنٹ کالج کا چارج لینا ہے۔

جوں جوں واپسی کے دن قریب آتے جاتے ہیں دل میں عجیب امنگیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ہیجان کے اتنے سال تم سے وابستہ رہ کر گزارے ہیں کہ ہر امنگ کے ساتھ تم آپ ہی آپ دل میں چلے آتے ہو۔ کبھی کبھی ڈرتا ہوں کہ نہ معلوم اس درمیانی عرصہ میں طبیعتوں کی آب و ہوا بالکل ہی نہ بدل گئی ہو لیکن پھر سوچتا ہوں کہ جوانی کے علاقے اور رشتے کبھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں کبھی تن جاتے ہیں۔ لیکن موت سے پہلے ٹوٹتے نہیں۔ اور الحمدللہ کہ تم اور میں دونوں ابھی موت سے بہت دور ہیں اس امید کی بنا پر لاہور آنے کے خیال سے بجز مسرت کے اطمینان کے کوئی جذبہ دل میں نہیں اٹھتا۔ تابستان کی طویل دوپہریں اور زمستان کی طویل راتیں اور احباب کی طویل ہرزہ گوئیاں پھر یاد آتی ہیں۔

بہت تھک گیا ہوں۔ گیارہ سال بجز بیماری کے ایک دن کی بھی رخصت نہیں لی۔ موسم گرما کی تین مہینے کی چھٹیاں اور دوستوں کی گرم محفلیں پھر بلا رہی ہیں۔ زبیدہ واپس جانے پر اتنی خوش ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ حجاب کو ہم دونوں کا سلام قبول ہو۔ اور یاسمین کو پیار۔ کل حمید صاحب اور تاثیر سے ملاقات ہوئی خدا ثریا کی زندگی کو کامران بنائے۔ بہت سی باتیں کرنے کو دل چاہتا لیکن اب ان کے لئے کئی موقعے نصیب ہوں گے۔ ۲۰ نومبر کو چند دن کے لئے شاید دوسرے پرسوں لاہور آجاؤں۔ کیا تم اس خط کے جواب میں خط لکھو گے۔

۲ — نومبر

خاکسار

بخاری

ہماری منفرد کتابیں

دینی کتب

- مضامینِ قرآنِ حکیم (دوسرا ایڈیشن) — زاہد ملک — ۱۵۰ روپے
- خلاصہ مطالب قرآن — جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن — ۴۰ روپے
- قرآن ۔ ایک نظر میں — مولانا محمد میاں صدیقی — ۷۰ روپے
- قرآن اور ادیب — زاہد ملک — ۳۰ روپے
- اسلامی حدود و تعزیرات — ڈاکٹر طفیل احمد قریشی — ۵۰ روپے
- خطبات رسولؐ — پروفیسر امتیاز سعید — ۲۵ روپے
- مکاتیب رسولؐ — عزیز ملک — ۲۰ روپے
- بلال حبشیؓ — عزیز ملک — ۲۰ روپے
- جرم و سزا کا اسلامی فلسفہ — جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن — ۳۰ روپے
- اسلامی نظام عدالت — جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن — ۲۵ روپے
- فقہ اسلامی کا تاریخی ارتقار — جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن — ۲۰ روپے

نعتیہ مجموعے

- حرف حرف روشنی — قمر صدیقی — ۲۵ روپے
- بحضور صاحب لولاکؐ — بیدل ابروقی — ۱۵ روپے
- منتخب نعتیں ۔ ۸۱ ۔ ۸۲ — مرتبہ: تابش صدیقی — ۲۵ روپے

قومی مشاہیر

- قائد اعظمؒ کا اسلامی کردار — کرم حیدری — ۳۰ روپے
- اقبالؒ کا نظریۂ اجتہاد — ڈاکٹر خالد مسعود — ۴۰ روپے

شاعری

- خواب سراب — ضیاء جالندھری — ۴۰ روپے
- منتخب غزلیں ۔ ۸۲ء — مرتبہ: ناصر زیدی — ۲۵ روپے
- منتخب غزلیں ۔ ۸۳ء — مرتبہ: ناصر زیدی — ۲۵ روپے

افسانوی ادب

- منتخب افسانے ۷۹ ۔ ۸۰ء — مرتبہ: فتح محمد ملک / محمد منشایاد — ۴۰ روپے
- منتخب افسانے ۔ ۸۱ء — مرتبہ: فتح محمد ملک / محمد منشایاد — ۳۵ روپے
- منتخب افسانے ۔ ۸۲ ۔ ۸۳ء — مرتبہ: فتح محمد ملک / محمد منشایاد — ۴۰ روپے
- روغنی پتلے — ممتاز مفتی — ۴۰ روپے
- ساتواں چراغ — میرزا ادیب — ۴۰ روپے
- خلا اندر خلا — محمد منشایاد — [illegible]۰ روپے

طنز و مزاح

- مثبت نتائج — زاہد ملک — ۲۵ روپے
- طنز و مزاح ۔ ۸۱ء — مرتبہ: منصور قیصر — ۲۵ روپے
- فی سبیل اللہ — مجیب الرحمٰن مفتی — ۲۵ روپے

سفرنامہ

- مسافر حرم (سفرنامہ حجاز) — کرنل غلام سرور — ۲۵ روپے

تنقید و تحقیق

- فلسطین اردو ادب میں — فتح محمد ملک — ۴۰ روپے
- پطرس ۔ ایک مطالعہ — کرنل غلام سرور — ۴۰ روپے

سیاسیات

- PAKISTAN AND THE ASIAN COLLECTIVE SECURITY SYSTEM
  IKRAM AZAM
  Rs. 40/-
- AFGHANISTAN—SOME ASPECTS
  S IRTIZA HUSAIN

مطبوعاتِ حرمت
بینک روڈ ۔ راولپنڈی — فون: ۹۲۰۰۶